دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

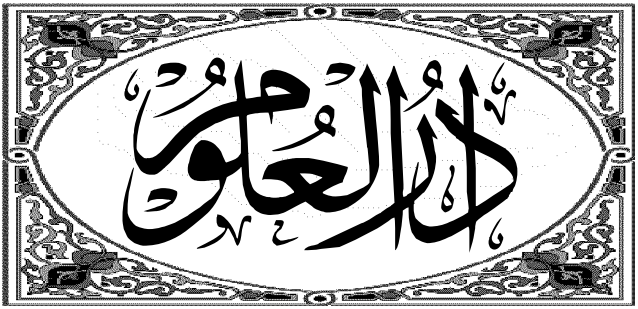

جلد: ۱۰۰ | ربیع الاوّل ۱۴۳۸ھ مطابق دسمبر ۲۰۱۶ء | شمارہ: ۱۲

نگراں

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.: 2133/57
Vol. No. 100, Issue No. 12, December 2016 दिसम्बर **2016**
Printer Publisher :- Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
Owner :- Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 20/= | Annual Subscription Rs. 200/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۴۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۷۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۷۰۰ روپئے

فہرست مضامین

نمبرشمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	محمد سلمان بجنوری	۳
۲	رسول اللہ ﷺ کی تاریخِ ولادت کی تحقیق	حضرت مفتی رضاء الحق	۱۰
۳	اسلام کا معاشی انقلاب	مولانا محمد اللہ قاسمی	۱۷
۴	دارالعلوم دیوبند اور اردو زبان	مولوی فاروق اعظم قاسمی	۲۳
۵	اردو صحافت کی بدلتی قدریں-لمحۂ فکریہ	مولانا محمد مجیب الرحمٰن دیودرگی	۳۸
۶	خواتین کا ذوقِ عبادت	مولانا محمد غیاث الدین حسامی	۴۲
۷	مسائل وفتاویٰ	ادارہ	۴۹
۸	احوال وکوائف دارالعلوم دیوبند	ادارہ	۵۳
۹	نئی کتابیں	مولانا اشتیاق احمد قاسمی	۵۵

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

محمد سلمان بجنوری

زیرِ نظر شمارہ پر ماہ نامہ ''دارالعلوم'' کی جلد ۱۰۰ مکمل ہورہی ہے۔ اس مناسبت سے سطور ذیل میں دارالعلوم دیوبند کی اُن خدمات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، جو تحریر وصحافت کی راہ سے وجود میں آئی ہیں، اس ضمن میں دارالعلوم سے شائع ہونے والے رسائل ومجلّات بالخصوص ماہ نامہ دارالعلوم کی مختصر تاریخ کے ساتھ، ان رسائل کے مقاصد پر بھی مختصر معروضات پیش کی گئی ہیں۔

رندانِ قناعت پیشہ نے رکھی تھی بنائے مے خانہ
جھکتا ہے انہی کے قدموں پر، چلتا ہے جو کوئی پیمانہ

دارالعلوم دیوبند کے مقاصدِ تاسیس جو اس کے قدیم دستورِ اساسی میں بیان کیے گئے ہیں، ان میں تیسرا نمبر اس طرح ہے:

''اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دین کا تحفظ ودفاع اور اشاعت اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر و تقریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم وتبلیغ کے ذریعے سے خیر القرون اور سلف صالحین، جیسے اخلاق واعمال اور جذبات پیدا کرنا۔''

اس دفعہ کی روشنی میں اسلام کی تحریری خدمت انجام دینا، اس مرکز علم وعمل کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ اپنے بنیادی مقاصد کی تکمیل اس ادارے نے کس انداز سے کی ہے، یہ ایک ضخیم تاریخ کا موضوع ہے، گذشتہ ڈیڑھ صدی اس بات کی گواہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کو اللہ رب العزت نے، اس کے مقاصدِ قیام میں، اس کے بانیانِ عالی مقام کے عزائم وتصورات سے کہیں زیادہ کامیابی عطا فرمائی ہے، ان مقاصد میں سے جہاں تک تحریر کی راہ سے اسلام کی خدمت انجام

دینے کا تعلق ہے، اس کے بھی دو حصے ہیں: ایک تصنیف وتالیف، دوسرے تحریر وصحافت۔ تصنیف و تالیف کی راہ سے انجام پانے والی خدمات اس وقت زیر بحث نہیں ہیں؛ کیوں کہ دارالعلوم دیوبند کے اکابر وفرزندان اور وابستگان کے ہاتھوں دینِ اسلام کی تشریح وتعبیر اور علومِ اسلامیہ کی تنقیح وتوضیح کے لیے وقت کا سب سے معتمد اور نمایندہ کتب خانہ وجود میں آیا ہے، جس کے تعارف کے لیے ہزاروں صفحات درکار ہوں گے۔

پھر تحریر وصحافت کے ذریعہ وجود میں آنے والی خدمات کے بھی دو پہلو ہیں: ایک براہ راست دارالعلوم کی خدمات دوسرے فرزندان اور وابستگان کی خدمات۔ اگر اس دوسرے پہلو سے جائزہ لیا جائے تو یہ بھی ایک طویل تاریخ کا موضوع ہے؛ کیوں کہ اس کے لیے آپ کو گذشتہ سو ڈیڑھ سو برس میں علماء وفضلائے دیوبند کے ذریعہ وجود میں آنے والے یا ان کی ادارت میں شائع ہونے والے رسائل ومجلّات اور اخبارات کا جائزہ لینا ہوگا، پھر اسی سے ایک گوشہ اردو زبان وادب کی خدمت کا نکل آئے گا، اس موضوع پر بعض حضرات نے کام کیا بھی ہے، تاریخ دارالعلوم دیوبند مرتبہ جناب سید محبوب رضوی صاحبؒ اور خاص طور پر دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ مرتبہ مولانا محمد اللہ صاحب قاسمی میں، اس پر اختصار وجامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ (اردو زبان کی خدمت سے متعلق ایک مضمون اس اشاعت میں بھی شامل ہے) اس لیے ان تمام تفصیلات کو کسی دوسری فرصت ومناسبت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں اور سرِ دست براہِ راست دارالعلوم دیوبند سے جاری ہونے والے رسائل وجرائد پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

اس سلسلے کا باضابطہ آغاز ماہ نامہ ''القاسم'' سے ہوا۔ سب سے پہلے نمونہ کا ایک رسالہ تیار کرکے، دارالعلوم کی تاریخ کے نہایت اہم جلسۂ دستار بندی منعقدہ ۶، ۷، ۸/ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ کے موقع پر شائع کیا گیا، اس کے ٹائٹل کی عبارت اس طرح تھی: القاسم یعنی اس علمی، ادبی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی، تاریخی رسالہ کا نمونہ اور اشتہار، جو مولانا اشرف علی صاحب ومولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور دیگر مقدس ومقتدر علماء کی سرپرستی میں ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیوبند سے شائع ہوگا۔ اس رسالہ کے مرتب حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں محدث دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ تھے، انھوں نے رسالہ کی ضرورت پر مختصر اظہارِ خیال کے بعد، چند انتظامی امور کی وضاحت کی، جن میں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں: ایک یہ کہ ''اس قسم کا رسالہ بزرگانِ مدرسہ کی سرپرستی میں شائع ہوگا؛ لیکن اس کے مصارف کا تعلق مدرسہ سے نہ ہوگا'' دوسرے یہ کہ ''مدیر اور ناظم اس کے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن

اور جناب مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی ہوں گے''۔اسی کے ساتھ یہ ارادہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ ''الرشید'' کے نام سے ایک دوسرا رسالہ بھی شروع کیا جائے گا۔

اس کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی قدس سرہٗ کے قلم سے پانچ چھ صفحات کا ایک تمہیدی مضمون ہے، جس میں نہایت بلاغت کے ساتھ رسالہ کے اجراء کی ضرورت اور مقصد کو واضح کیا گیا ہے، شروع میں ایک فارسی نظم کی شکل میں رسالہ کے اجراء پر گفتگو کی گئی ہے، دس اشعار کی یہ نظم بھی اپنی سلاست ولطافت میں ایک ادبی شاہ کار ہے۔

نظم کے بعد عنوان ہے: ''ضرورت ہی کیا تھی'' اس کے تحت حضرت مولانا عثمانیؒ نے اخبارات ورسائل کی کثرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ سب کچھ صحیح ہے؛ لیکن کچھ ضرورتیں دینی، مذہبی اور تمدنی ایسی بھی تھیں، جن کو خیال کرتے ہوئے، نہ صرف مستحسن؛ بلکہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ان کے تدین وتمدن میں عام غلط فہمی وگمراہی سے بچانے، سیدھی اور سچی راہ چلانے، اسلام کے اصلی ذائقہ سے واقف کرنے، قوتِ روحانی کو ترقی دینے کے لیے ایسا سامان کردیا جائے جو اُن کے لیے سچا رہنما، افراط وتفریط میں مبتلا ہونے سے بچانے والا ہو۔''

اس کے بعد مسلمانوں کے حالات کی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اب جن لوگوں میں دینی امور کی طلب بھی ہے، ان کا طریقۂ طلب بھی بدل چکا ہے، اب وہ بھی گھر بیٹھے معلومات چاہتے ہیں، عام ذوق اخباروں کے مطالعہ کا ہوگیا ہے۔ یا مخربِ اخلاق ناولوں کا، نیز علماء کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں اور اسلام کے بے مثال اصولِ تمدن ومعاشرت کو بیان نہیں کیا جارہا ہے، اس کے بعد فرمایا:

''یہ ضرورتیں تھیں جو ایک طرف تو خود علماء کے مقدس طبقہ کو اس طرف مائل کرتی تھیں۔ دوسری طرف تجربہ کار حضرات مجبور کرتے تھے کہ علماء کی طرف سے قوم کی ایسی عام خدمت ہونی چاہیے، جس سے ہر طبقہ کا شخص نفع اٹھا سکے، اسلام کے صحیح قواعد، قدیم اصول، علمِ کلام کے مسائل، سلف کے حالات بلا رنگ آمیزی شائع ہوتے رہیں، جوشِ محبت رکھنے والے طالبانِ صادق کو سچے اور سادہ طریقہ سے اسلام کے سہل اور مشکل مسائل کی تعلیم دی جائے۔ تاریخی صحیح حالات ایسے بے کم وکاست بیان کیے جاویں کہ دل بستگی اور ترقی معلومات کا ذریعہ بنیں، جدید اعتراضات، فلسفیانہ اصول، پیچیدہ صورتوں کے جوابات اصولِ اسلام کو ملحوظ رکھ کر ایسے صاف اور واضح

دیے جائیں کہ جس سے مسلمانوں کا اطمینان بڑھے اور اسلام کی خوبیاں ذہن نشین ہوتی جائیں۔''

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کی تحریر کا یہ خلاصہ اس لیے پیش کیا گیا کہ اس سے ان دینی رسائل وجرائد کے مقاصد پر بڑی جامعیت کے ساتھ روشنی پڑتی ہے۔ بہرحال اس طرح ماہ نامہ ''القاسم'' کی اشاعت شروع ہوئی اور دو تین سال تک وہ مصارف کے اعتبار سے مولانا عثمانیؒ کی ذات سے وابستہ رہا، اگرچہ ترجمان وہ دارالعلوم ہی کا تھا، پھر جب پرچہ کی مالی حالت قابلِ اطمینان ہوگئی تو ۱۳۳۱ھ میں اس کے مصارف کا تعلق بھی دارالعلوم سے کردیا گیا۔ یہ رسالہ ابتدائی سالوں میں مطبع احمدی علی گڈھ میں چھپتا تھا، جس کے مالک حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری (انبیٹھوی) قدس سرہ کے حقیقی بھائی مولانا رشید احمد تھے۔

اس کے ایک سال بعد حسبِ اعلان دوسرا ماہ نامہ ''الرشید'' کے نام سے شروع کردیا گیا۔ ادارت اس کی بھی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ سے متعلق رہی۔ ان کے معاون کے طور پر حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحبؒ کے علاوہ حضرت مولانا سراج احمد رشیدیؒ نے بھی کام کیا۔ القاسم اور الرشید دونوں رسائل میں وقت کے اکابر علماء حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، فخر المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ بعض شماروں میں حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے افادات بھی ملتے ہیں، ان کے علاوہ دیگر علماء جیسے خود مدیر محترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ، حضرت مولانا اصغر حسین میاں صاحبؒ، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ جیسے حضرات مستقل مضمون نگاروں میں شامل تھے۔ انہی دونوں رسائل سے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تحریری خدمت کا آغاز ہوا، جس کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں انھوں نے اپنی کتاب ''احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' میں کیا ہے۔

القاسم اور الرشید دونوں رسائل نے اپنے بلند پایہ علمی محققانہ مضامین ومقالات سے علمی دنیا میں بڑی اہمیت حاصل کی؛ مگر تقدیری بات کہ ۱۳۴۱ھ میں ان دونوں رسائل کا سلسلہ بند ہوگیا اور تقریباً بیس سال تک کسی رسالہ کا اجراء نہ ہوسکا؛ جب کہ ضرورت کا احساس مسلسل باقی رہا۔

آخر کار ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں ''ماہ نامہ دارالعلوم'' کے نام سے ایک رسالہ کا آغاز کیا گیا جس کے مقاصد اس طرح بیان کیے گئے:

(۱) دارالعلوم کے حالات وکوائف سے معاونین ومتوسلین دارالعلوم کو باخبر رکھنا۔

(۲) اسلام کی تعلیمات کو سہل و دل نشیں پیرایے میں پیش کر کے مسلمانوں میں صحیح ذہنیت پیدا کرنا۔

(۳) علمی مسائل کے متعلق علمائے دیوبند کے محققانہ مقالات اور حالاتِ حاضرہ پر دارالعلوم کا موقف پیش کرنا۔

(۴) مخالفینِ اسلام کے حملوں کی سنجیدگی کے ساتھ مدافعت کرنا۔

ان بلند پایہ مقاصد کے تحت اس رسالہ نے اپنا سفر شروع کیا جو الحمدللہ آج تک جاری ہے۔

ماہ نامہ دارالعلوم کی ادارت کی ذمہ داری سب سے پہلے مولانا عبدالوحید صدیقی غازی پوری کے حوالے ہوئی جنھوں نے بعد میں ''نئی دنیا'' کے بانی و مدیر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

ان کے بعد قاضی خلیق احمد صدیقی سردھنوی، مدیر مقرر ہوئے جن کی ادارت میں نومبر ۱۹۴۸ء تک رسالہ نکلتا رہا۔ان کی نگارشات پر نظر ڈالنے سے ان کی سلاستِ قلم کا اندازہ ہوتا ہے۔

دسمبر ۱۹۴۸ء سے ادارت کی ذمہ داری ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ کے حوالے ہوئی، جو اپنی مشہور کتاب ''مصباح اللغات'' کی نسبت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں؛ مگر ان کی مدتِ ادارت بہت مختصر ہے، دسمبر ۱۹۴۸ء تا جون ۱۹۴۹ء ان کی ادارت میں ماہ نامہ دارالعلوم شائع ہوا، اور اسی جون والے شمارے میں مالی مشکلات اور بعض دیگر اسباب کی بنا پر ماہ نامہ دارالعلوم کو بند کر کے سہ ماہی کرنے کا اعلان کیا گیا اور یہ بھی کہ آئندہ یہ سہ ماہی رسالہ صرف کوائفِ دارالعلوم پر مشتمل ہوا کرے گا؛ چنانچہ اس کے بعد ماہ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ کا شمارہ کوائفِ دارالعلوم دیوبند کے نام سے مولانا سید ازہر شاہ قیصر کی ادارت میں شائع ہوا۔ یہ خاتم المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ قدس سرہ کے صاحبزادے تھے اور قلم کے بادشاہ تھے، ماہ نامہ دارالعلوم کے مدیر کی حیثیت سے ان کی بڑی شہرت ہوئی ان کی ادارت میں بہت جلد رسالہ سہ ماہی سے دوبارہ ماہ نامہ ہوگیا اور اس کا معیار بلند ہوگیا۔ اسی دور میں ماہ نامہ دارالعلوم کی جلدوں کی ترتیب میں کچھ تبدیلی ہوئی اور کسی انتظامی مصلحت سے کچھ عرصہ تک چھ ماہ کی ایک جلد شمار کی گئی۔ مولانا سید ازہر شاہ قیصر کی ادارت کا زمانہ بہت طویل ہے ۱۹۴۹ء سے ۱۹۸۱ء تک مسلسل وہ مدیر رہے، درمیان میں سترہ سال اداریہ لکھنے کی ذمہ داری مولانا مفتی محمد ظفیر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے پوری کی؛ لیکن حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قدس سرہ کے اخیر زمانۂ اہتمام تک مدیر مولانا سید ازہر شاہ قیصر ہی رہے۔

اس کے بعد انتظامیہ کی تبدیلی ہوئی اور حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ

منصبِ اہتمام پر فائز ہوئے تو ان غیر یقینی اور مشکل حالات میں ماہ نامہ دارالعلوم کی ذمہ داری حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری مدظلہٗ، استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند کے حوالے ہوئی۔ ان کی ادبی حیثیت، تحریری سلیقہ اور حسنِ تعبیر کا فطری ملکہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، ''ایضاح البخاری'' اور ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' ان کے علمی کارنامے اور ترانۂ دارالعلوم ان کا ادبی شاہ کار ہے۔ حضرت موصوف نے ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۴ء تک ادارت کی ذمہ داریاں پوری کیں۔ اس کے بعد جب ان کی انتظامی مصروفیات بہت زیادہ ہوگئیں تو ادارت کی ذمہ داری حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہٗ کے حوالہ کردی گئی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی ادارت ماہ نامہ دارالعلوم کی تاریخ میں مولانا سید از ہر شاہ قیصر کی طرح بہت طویل ہے، وہ ۱۹۸۴ء میں مدیر بنائے گئے اور ابھی گذشتہ ماہ نومبر ۲۰۱۶ء میں اپنی بڑھتی عمر اور بلند پایہ تدریسی اور علمی مصروفیات کی بناء پر اس خدمت سے معذرت کی۔ اس طویل مدت میں ان کے رواں قلم سے اداریوں کے علاوہ بھی بے شمار مضامین صادر ہوئے۔ ان کے علمی مضامین کا مجموعہ ''مقالاتِ حبیب'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ عربی اور اردو میں تقریباً تیس کتابیں یا رسائل ان کے قلم سے وجود میں آچکے ہیں۔ حضرت موصوف کے دور ادارت میں متعدد خاص نمبر بھی شائع ہوئے، جن میں ''ختمِ نبوت نمبر'' اور ''الاحسان نمبر'' خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

اسی دور میں پندرہ روزہ ''آئینۂ دارالعلوم'' کا اجراء عمل میں آیا، جو مولانا کفیل احمد صاحب علوی مدظلہ کی ادارت میں ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۹ء تک جاری رہا، ان اردو رسائل کے علاوہ دارالعلوم دیوبند سے عربی رسائل بھی جاری ہوئے، سب سے پہلے ۱۳۸۵ھ میں عربی سہ ماہی ''دعوۃ الحق'' کا اجراء ہوا، جس کے رئیس التحریر، شیخ الادب واللغہ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمہ اللہ تھے، اس کے بعد مجلّہ ''الداعی'' کا آغاز ہوا، جو پہلے پندرہ روزہ تھا، پھر ۱۹۹۳ء سے ماہ نامہ ہوگیا، اس کی ادارت کے فرائض ابتدائی چند سالوں میں حضرت مولانا بدرالحسن قاسمی مدظلہ نے بحسن وخوبی انجام دیے، اس کے بعد سے یہ مجلّہ حضرت مولانا نور عالم خلیل الامینی مدظلہ کی ادارت میں نکلنے لگا اور مسلسل ترقی اور مقبولیت کے مدارج طے کرتا رہا اور آج حضرت مولانا کی انتھک محنت اور عربی انشاء وادب میں ان کے بلند مقام کی وجہ سے عربی کے موقر رسائل میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ اب حضرت مولانا کے ساتھ کچھ مدت سے مولانا عارف جمیل مبارکپوری استاذ تفسیر

وادب دارالعلوم دیوبند، مجلّہ ''الداعی'' کے مدیرالتحریر کی حیثیت سے مصروف عمل ہیں۔

یہ ایک سرسری جائزہ ہے دارالعلوم سے صادر ہونے والے مختلف جرائد بالخصوص ماہ نامہ دارالعلوم کا، جو اپنے سفر کے موجودہ مرحلے میں ایک بندۂ عاجز وناتواں کے حوالے ہوا ہے۔ اللہ رب العزت سرخ روفرمائے! آمین۔

==========

آہ حلب/شام

مصر کے معروف ادیب مصطفیٰ لطفی منفلوطی نے اپنی مشہور کتاب "العبرات" کے ابتدائیہ کے طور پر ایک مختصر سی عبارت لکھی تھی جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''دنیا میں پریشان حال لوگ بہت ہیں اور میرے جیسے کسی بدحال شخص کی یہ طاقت نہیں ہے کہ ان کی بدحالی وسیہ بختی کا کچھ حصہ بھی مٹاسکے، تو کم ازکم اتنا تو کروں کہ ان کے سامنے یہ چند آنسو بہالوں، ہوسکتا ہے وہ میرے اس گریہ میں اپنے لیے قدرے تسلی اور سکون کا سامان پالیں۔''

اس وقت حلب کے حالات پڑھ کر اور سُن کر منفلوطی کی یہ عبارت یاد آرہی ہے، اس تبدیلی کے ساتھ کہ ہم شاید اپنے بدحال بھائیوں پر آنسو بہانے کے لائق بھی نہیں رہے اور خود وہ بھی اس مرحلے سے گذر چکے ہیں کہ کسی کے آنسو، ان کے لیے سامانِ تسلی بن سکیں۔

اور یہ صورتِ حال صرف حلب شہر کی نہیں، صرف ملکِ شام کی نہیں؛ بلکہ عالمِ اسلام کے متعدد ممالک میں مسلمان اسی قسم کے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اقبال مرحوم نے توصقلیہ کو مخاطب کرکے کہا تھا۔

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی
غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

لیکن آج ایک بغداد، ایک جہان آباد، ایک غرناطہ، یا ایک صقلیہ کا مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ ''تن ہمہ داغ داغ شد، پُنبہ کجا کجا نہم'' والا معاملہ درپیش ہے؛ بلکہ مرہم رکھنے کی بات بھی کہیں زیرغور نہیں ہے، ایسے حالات میں سوائے اس کے کیا کہیں کہ ع

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے

رسول اللہ ﷺ کی تاریخِ ولادت کی تحقیق

افادات: حضرت مفتی رِضاء الحق
شیخ الحدیث ومفتی دارالعلوم زکریا، جنوبی افریقہ
ترتیب وتخریج: اویس گودھروی
استاذ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل، گجرات

محققین کے نزدیک آپ ﷺ نو (۹) ربیع الاول کی صبح کو پیدا ہوئے، جو شمسی لحاظ سے ۲۰/اپریل ۵۷۱ء کا دن تھا۔

تحقیقِ تاریخِ ولادت

سال: یہ بات مسلّم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت عام الفیل میں ہوئی تھی، اس پر سب ہی مؤرخین وسیرت نگار متفق ہیں۔(البداية والنهاية ۲/۳۲۱، صفة الصفوة ۱/۵۱. وينظر: الروض الأنف ۱/۲۷۶)

واقعۂ فیل کے کتنے دنوں بعد آپ کی ولادت ہوئی؟ اس بارے میں متعدد اقوال ہیں؛ مگر مشہور قول ۵۰/دن کا ہے۔

ولد عام الفيل ... فقيل: بعده بشهر ... وقيل: بخمسين يوما، وهو أشهر. (البداية والنهاية ۲/۳۲۱)

مہینہ: اس سلسلہ میں علامہ قسطلانی رحمہ اللہ تعالی (م۹۲۳ھ) نے چھ اقوال نقل فرمائے ہیں: (۱) محرم (۲) صفر (۳) ربیع الاول (۴) ربیع الآخر (۵) رجب (۶) رمضان؛ مگر جمہور اس بات پر متفق ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ماہِ ربیع الاول میں ہوئی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: ثم الجمهور على أنه كان في شهر ربيع الأول. (البداية والنهاية ۲/۳۲۰)

مشہور محقق عالم علامہ محمد زاہد کوثری رحمہ اللہ تعالی (م۱۳۷۱ھ) نے تاریخ ولادت پر اچھی تحقیق فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ربیع الاول کے علاوہ کسی اور مہینہ کا قول علمائے ناقدین کے نزدیک سبقتِ قلم کے قبیل سے ہے۔ (مقالات الكوثري، ص ٤٠٥)

دن: اس بات پر بھی اربابِ سیر وتاریخ کا اتفاق ہے کہ آپ کی ولادت پیر کے دن ہوئی۔

وفي الحديث: وسئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن يوم الاثنين؟ قال: ذاك يوم ولدت فيه، ويوم بعثت... (صحيح مسلم، رقم:١١٦٢، باب استحباب ثلاثة أيام من كل شهر) (البداية والنهاية ٢/٣١٩)

تاریخ: ماہِ ربیع الاول کی کونسی تاریخ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی تھی؟ اس کے متعلق بعض علماء کا کہنا ہے کہ ربیع الاول میں پیر کے دن ہوئی؛ مگر تاریخ کا تعین نہ ہوسکا؛ جب کہ جمہور فرماتے ہیں کہ تاریخ متعین ہے۔ پھر وہ کونسی تاریخ تھی؟

علامہ قسطلانی رحمہ اللہ تعالی (م۹۲۳ھ) نے اس سلسلہ میں کل سات اقوال نقل فرمائے ہیں: (۱) ربیع الاول کی دوسری (۲) آٹھویں (۳) دسویں (۴) بارھویں (۵) سترھویں (۶) اٹھارھویں (۷) بائیسویں۔ (المواهب اللَّدُنِّيَّة ١/١٤٠-١٤٢)

علامہ کوثریؒ فرماتے ہیں کہ: (۱) آٹھویں تاریخ ختم ہونے کے بعد یعنی نویں تاریخ (۲) دسویں تاریخ (۳) بارھویں تاریخ۔ ان تین اقوال کے علاوہ دیگر چار اقوال قابل التفات نہیں۔ تو اب کل بحث کا محور انھیں تین روایات میں سے راجح کی ترجیح ہے۔

دسویں تاریخ کی روایت

اس روایت کو ابن سعد (م۲۳۰ھ) نے محمد باقر (م۱۱۴ھ) کی طرف منسوب کیا ہے؛ لیکن اس کی سند میں تین رُوات متکلَّم فیہ ہیں؛ اس لیے دس تاریخ والی روایت قابلِ ترجیح نہیں ہے۔ اس روایت کی طرف علامہ کوثری رحمہ اللہ تعالی نے اشارہ فرمایا ہے۔ وہ روایت طبقات سے نقل کی جاتی ہے:

قال ابن سعد : أنا محمد بن عمر بن واقد الأسلمي قال: ثني أبو بكر بن عبد الله بن أبي سبرة عن إسحاق بن عبد الله بن أبي فروة عن أبى جعفر محمد بن علي (ويعرف بمحمد الباقر) قال: ولد رسول الله صلى الله عليه وسلم لِعشرٍ خَلَون من شهر

ربيع الأول...، فبين الفيل وبين مولد النبي صلى الله عليه وسلم خمس وخمسون ليلة. (الطبقات الكبرى لابن سعد ۱/ ۱۰۰ ذكر مولد رسول الله صلى الله عليه وسلم)

بارہویں تاریخ کی روایت

اس قول کو محمد بن اسحاق (م ۱۵۱ھ) نے نقل کیا ہے؛ مگر اس کی کوئی سند بیان نہیں کی، اگرچہ یہ قول سب سے زیادہ مشہور ہے اور اہلِ مکہ کی مجالسِ مولود پرانے زمانے سے اسی تاریخ میں ہوتی رہی ہیں، نیز دنیا بھر میں محافلِ مولود اور جلسے اسی دن کیے جاتے ہیں؛ مگر روایت سے اس دن ولادت ہونے کا ثبوت نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں: مستدرکِ حاکم (م ۴۰۵ھ) میں ہے:

أخبرنا أبو الحسن محمد بن أحمد بن شبويه بمرو، ثنا جعفر بن محمد النيسابوري، ثنا علي بن مهران، ثنا سلمة بن الفضل عن محمد بن إسحاق قال: ولد رسول الله صلى الله عليه وسلم لاثنتي عشرة ليلة مضت من شهر ربيع الأول. (المستدرك على الصحيحين للحاكم، رقم: ٤١٨٣)

یہ روایت بھی سندِ متصل نہ ہونے کی وجہ سے قابلِ التفات نہیں اور اس کا حال بھی ان روایات کی طرح ہے جن کی سند نہ ہو۔

نویں تاریخ کا قول

عقلاً اور نقلاً اس بات کو ترجیح حاصل ہے کہ آپ کی ولادت آٹھویں تاریخ کے ختم پر نویں تاریخ کو ہوئی۔

روایتاً: (۱) علامہ ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) نے اس بارے میں اختلاف نقل کرتے ہوئے اس قول کو سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔

قال أبو عمر: وقد قيل: لثمان خلون منه ، وقيل ...، وقيل... (الاستيعاب لابن عبد البر ۱/ ۳۰)

(۲) حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: وقيل: لثمان خلون منه، حكاه الحميدي عن ابن حزم، ورواه مالك وعقيل ويونس بن يزيد وغيرهم عن الزهري عن محمد بن جبير بن مطعم، ونقل ابن عبد البر عن أصحاب التاريخ أنهم صحَّحوه، وقطع به الحافظ

الكبير محمد بن موسى الخوارزمي، ورجَّحه الحافظُ أبو الخطاب بن دحية في كتابه "التنوير في مولد البشير النذير". (البداية والنهاية ۲/۳۲۰)

(۳) حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ (م۱۳۸۲ھ) تحریر فرماتے ہیں: عوام میں تو مشہور قول یہ ہے کہ ۱۲؍ربیع الاول تھی، اور بعض کمزور روایات اس کی پشت پر ہیں، اور اکثر علماء ۸؍ ربیع الاول کہتے ہیں؛ لیکن صحیح اور مستند قول یہ ہے کہ ۹؍ربیع الاول تاریخ ولادت ہے، اور مشاہیر علمائے تاریخ اور حدیث اور جلیل المرتبت ائمۂ دین اسی تاریخ کو صحیح اور اثبت کہتے ہیں؛ چنانچہ حمیدی، عقیل، یونس بن یزید، ابن عبداللہ، ابن حزم، محمد بن موسیٰ خوارزمی، ابوالخطاب ابن دحیہ، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، شیخ بدرالدین عینی رحمہم اللہ اجمعین جیسے مقتدر علماء کی یہی رائے ہے۔ (قصص القرآن ۴/۲۵۳)

(۴) علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بھی نو (۹) تاریخ کو ولادت ہونا راجح قرار دیا ہے۔ (رحمۃ للعالمین ۱/۳۸-۳۹)

درایتاً / عقلاً:

(۱) محمد بن موسیٰ خوارزمی (م۲۳۵ھ) فلکیات کے بہت بڑے امام ہیں، ان کا حوالہ ابھی اوپر کی عبارت میں ذکر کیا گیا۔

(۲) فن ریاضی کے بہت بڑے عالم علامہ محمود پاشا فلکی مصری (م۱۳۰۲ھ) نے فرانسیسی زبان میں " تقويم العرب قبل الإسلام " کے موضوع پر ایک بے مثال کتاب تالیف فرمائی ہے، اور علامہ احمد ذکی پاشا (م۱۳۵۳ھ) نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا ہے، جس کا نام "نتائج الأفهام في تقويم العرب قبل الإسلام وفي تحقيق مولد النبي وعمره عليه الصلاة والسلام" ہے۔ اس کتاب میں مشرق اور مغرب کے کئی ایک فلکی ماہرین کے اقوال کو مدنظر رکھ کر کی گئی تحقیق سے بھی نو (۹) تاریخ ہونا واضح ہے۔ (نتائج الأفهام ص۲۸-۳۵)

ان کی بیان کردہ وجوہات میں سے ایک وجہ کچھ اس طرح ہے:

رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں سنہ ۱۰ھ ماہِ شوال کی آخری تاریخ کو سورج گہن ہوا تھا، اُسی دن آپ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تھا۔

قال الحافظ (م۸۵۲ھ): يوم مات إبراهيم يعني ابنَ النبي صلى الله عليه وسلم، وقد ذكر جمهور أهل السير أنه مات في السنة العاشرة من الهجرة، فقيل:

... والأكثر على أنها وقعت في عاشر الشهر. (فتح الباري ۲/۵۲۹)

اس حساب سے اگر پیچھے شمار کیا جائے تو ربیع الاول کی نویں تاریخ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بابرکت ہونا ثابت ہوگا؛ اس لیے کہ پیر کا دن یوم پیدائش ہونا تو متفق علیہ ہے، اور وہ عام الفیل کے ربیع الاول میں نو (۹) تاریخ ہی کو آتا ہے۔ علامہ محمود پاشا فرماتے ہیں:

وقد اتفقوا جميعا على أن الولادة كانت في يوم الإثنين، وحيث إنه لا يوجد بين الثامن والثاني عشر من هذا الشهر يوم إثنين سوى اليوم التاسع منه، فلا يمكن أن نعتبر يوم الولادة خلاف هذا اليوم.

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تحریر فرماتے ہیں:

محمود پاشا فلکی نے (جو قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجم گذرا ہے) ہیئت کے مطابق جو زائچہ اس غرض سے مرتب کیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے اپنے زمانے تک کے کسوف اور خسوف کا صحیح حساب معلوم کرے، پوری تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سن ولادت باسعادت میں کسی حساب سے بھی دوشنبہ کا دن ۱۲ ربیع الاول کو نہیں آتا؛ بلکہ ۹ ربیع الاول ہی کو آتا ہے، اس لیے بلحاظِ قوت وصحتِ روایات اور باعتبارِ حسابِ ہیئت ونجوم ولادتِ مبارکہ کی مستند تاریخ ۹ ربیع الاول ہے۔ (قصص القرآن ۴/۲۵۳)

(۳) مذکورہ بالا کتاب "نتائج الأفهام في تقويم العرب قبل الإسلام وفي تحقيق مولد النبي وعمره عليه الصلاة والسلام" کے ایک ایڈیشن پر اپنے زمانے کے عظیم ونامور مؤرخ وادیب شیخ علی طنطاوی (م ۱۴۲۰ھ) نے مقدمہ لکھا ہے، جس میں آپ نے نو (۹) ربیع الاول کو ولادت باسعادت کا دن قرار دینے پر مؤلفِ کتاب کی پرزور تائید فرمائی ہے۔ (مقدمات الطنطاوي ۸۳)

(۴) محدثِ عظیم ومحققِ بے نظیر شیخ احمد شاکر (احمد بن محمد عبدالقادر م ۱۳۷۷ھ) نے بھی شیخ محمود پاشا فلکی کی تحقیق کو اختیار کرکے اس سے کسوفِ شمس کی تعیین میں مدد لی ہے۔ (حاشية الشيخ أحمد شاكر على "المحلّى بالآثار" ۵/۱۱۴-۱۱۵ لابن حزم الظاهري م ۴۵۶ھ)

(۵) سعودی عرب کے ایک محقق وماہر فلکیات عالم عبداللہ بن محمد بن ابراہیم (م ۱۴۱۶ھ) اپنی کتاب "تقويم الأزمان" میں تحریر فرماتے ہیں:

وقد ثبت بما لا يحتمل الشك من النقل الصحيح أن ولادته -صلى الله عليه وسلم- كانت في ۲۰/ نيسان ابريل سنة ۵۷۱ عام الفيل ... فبالإمكان معرفة يوم

ولادته ويوم وفاته بالدقة ... وعلى هذا فتكون ولادته -صلى الله عليه وسلم- يوم الإثنين، الموافق ٩ ربيع الأول سنة ٥٣ قبل الهجرة ويوافق ٢٠ / نيسان ابريل سنة ۵۷۱ء نقلا وحساباً. (تقويم الأزمان لإرشاد ذوى الألباب لمعرفة مبادئ السنين والشهور من طريق الحساب ص ١٤٣، الطبعة الأولى).

مزید دیکھیے: (۱) ایک مفصل مضمون بعنوان "تحديد ميلاده الشريف" ہمارے یہاں موجود کتاب "ماشاع ولم يثبت فى السيرة النبوية" تأليف: محمد بن عبد الله العوشن، ط: دار طيبة، الرياض" میں بھی مذکور ہے، جس میں شیخ عبداللہ بن محمد بن ابراہیم کی مذکورہ عبارت کے علاوہ دیگر علمائے کرام کے اقوال کی روشنی میں ۹/تاریخ ہونا راجح قرار دیا ہے۔

(۲) علامہ محمد زاہد کوثری رحمہ اللہ تعالی (م ۱۳۷۱ھ) کا ایک مختصر اور محقق مقالہ بعنوان "المولد الشريف النبوي" اس موضوع پر شائع ہوا ہے۔ انہوں نے بھی محمود پاشا فلکی کی مذکورہ کتاب سے استفادہ کیا ہے اور مؤلف کے بارے میں اونچے کلمات تحریر فرمائے ہیں۔

دیکھیے: (مقالات الكوثري ص۴۰۵ تا ۴۰۸، ط: مطبعة الأنوار بالقاهرة).

(۳) حضرت مولانا مفتی عمر فاروق لوہاروی دامت برکاتہم، شیخ الحدیث دارالعلوم لندن (یو-کے) کا ایک مضمون بعنوان "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخِ ولادت" ان کے بیش قیمت محقق و مدلل رسائل "فقہی جواہر" (ج ۱/ص ۶۸/تا ۷۱/) میں موجود ہے۔ ان رسائل پر اکابر علماء کی تقریظات ہیں، جن میں ایک دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدرالمدرسین حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم بھی ہیں۔

تنبیہ

بعض علماء نے آٹھویں تاریخ کا قول اختیار کیا ہے، تو یاد رہے کہ آٹھویں اور نویں تاریخ کے دو اقوال میں ترجیح دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک تطبیق حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی ہے، وہ یہ ہے کہ آٹھ (۸) اور نو (۹) ربیع الاول کا اختلاف حقیقی نہیں۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"۸ اور ۹ کا اختلاف حقیقی اختلاف نہیں؛ بلکہ مہینے کے ۲۹/اور ۳۰ کے حساب پر مبنی ہے، حساب سے جب یہ ثابت ہوگیا کہ صحیح تاریخ ۲۱/اپریل تھی تو آٹھ (۸) کے متعلق تمام اقوال دراصل نو (۹) کی تائید میں پیش ہوسکتے ہیں۔" (قصص القرآن ۴/۲۵۴)

وقت

کتبِ سیرت میں اس بات کی صراحت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت صبح صادق کے وقت ہوئی، اور مکہ مکرمہ میں ۲۰ ؍اپریل کو (۴:۳۹) پر صبح صادق ہوتی ہے؛ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۹ ربیع الاول عام الفیل، ۲۰ ؍اپریل ۵۷۱ء بہ روز پیر، بہ وقتِ صبح تقریباً ۴ بج کر ۴۰ منٹ پر اس دنیا میں تشریف لائے۔

خلاصہ

مذکورہ بالا تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ نقلاً وعقلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی معتمد تاریخ نو (۹) ربیع الاول ہے۔

ويتلخص من هذا أن سيدنا محمدا صلى الله عليه وسلم ولد يوم الإثنين ٩/ من ربيع الأول، الموافق العشرين من إبريل سنة ٥٧١ مسيحية، فاحرص على هذا التحقيق، ولا تكن أثيراً للتقليد. (نتائج الأفهام في تقويم العرب قبل الإسلام ص ٣٥)

مکانِ ولادت

جمہور کے نزدیک مکہ مکرمہ میں ولادت ہوئی۔ پھر جگہ کی تعیین میں تین اقوال ہیں۔ مشہور قول یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت شعبِ بنی ہاشم میں ہوئی۔ یہ مشہور جگہ ہے اور چند سال پہلے تک لوگ اس کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ چند سال پہلے سعودی حکومت نے اسے بند کردیا اور اس کی جگہ مکتبہ بنادیا۔

فی الدار التي فی الزقاق المعروف بزقاق المولد في شعب مشهور بشعب بني هاشم. (سبل الهدى والرشاد ١/٣٣٨).

من الطرف الشرقي لمكة، تزار ويتبرك بها إلى الآن. (تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس ١/١٩٨).

❁ ❁ ❁

اسلام کا معاشی انقلاب

از: مولانا محمد اللہ قاسمی
شعبۂ انٹرنیٹ، دارالعلوم دیوبند

اسلام نہ صرف روحانیت ہے اور نہ صرف مادیت؛ بلکہ دونوں کا حسین سنگم ہے۔ اسلام نے مادہ سے احتراز کی تاکید نہیں کہ ہے کہ انسان جوگ اور رہبانیت اختیار کرلے جیسا کہ ہندوازم، بدھ ازم اور عیسائیت وغیرہ میں ہوا، اور نہ انسانی معاشرہ کو مکمل طور پر مادیت کے حوالہ کیا گیا کہ انسان اپنی مادی خواہشات کے سامنے اپنی روحانی تقاضوں سے غافل ہوکر اپنی دنیا اور آخرت دونوں خراب کرلے، جیسا کہ آج کل مغرب کے ساتھ ہورہا ہے۔ اسلام نے انسان کی دنیوی زندگی فلاح وترقی میں مادیت کے کردار کو نہ صرف تسلیم کیا ہے؛ بلکہ اسلامی نظام میں مادیت کو نہایت اعتدال وتوازن کے ساتھ جگہ بھی دی ہے۔ اسلام نے کسبِ حلال کو اہم ترین فریضہ قرار دیا ہے اور تجارت، زراعت، صنعت اور ملازمت وغیرہ کے ذریعہ اپنی روزی خود کمانے کی تاکید کی ہے۔

اسلامی معاشی پالیسی کا یہ بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے کہ دولت کی گردش پورے معاشرے میں عام ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ مال صرف مال داروں میں ہی گھومتا رہے، مال دار کا مال دن بدن بڑھتا رہے اور غریب روز بروز کنگال ہوتا جائے۔ معاش کے سلسلے میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ سرمایہ کی گردش ہے۔ سرمایہ کی گردش اگر اس طرح ہو کہ وہ ہر طبقہ کے لوگوں تک پہنچتا رہے تو سب لوگ خوش حال ہوں گے اور اگر وہ صرف چند لوگوں کے درمیان گھومے تو خوش حالی بھی چند لوگوں کے حصے میں آئے گی اور بقیہ لوگ بدحالی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں گے۔ سرمایہ کی گردش معاشرہ کے جتنے زیادہ افراد کے درمیان ہوگی، اتنی ہی زیادہ اس کی قیمت بڑھتی چلی جائے گی۔ اسلام نے ایسا معاشی نظام برپا کیا کہ دولت پر بااثر لوگوں کی اجارہ داری قائم نہ رہے اور دولت کا بہاؤ امیروں کے ساتھ ساتھ غریبوں کی طرف بھی

رہے: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (سورۃ الحشر، آیت ۷)

اسلام کی معاشی پالیسی

اسلام افراد معاشرہ کے درمیان معاشی مساوات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ معاشی مساوات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک شخص کے پاس جتنی دولت ہو اتنی ہی دولت دوسرے کے پاس بھی ہو؛ کیوں کہ ایسی مساوات غیر فطری بھی ہے اور ناقابلِ عمل بھی۔ معاشرے کے ہر فرد کے پاس یکساں مال و دولت ہو ایسا ممکن نہیں ہے۔ ذہنی صلاحیت میں کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف افراد کے درمیان فرق ضروری ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس کے بغیر حقیقی معنوں میں کوئی مؤثر تمدنی نظام قائم نہیں ہوسکتا ہے؛ مگر دو انسانوں کے درمیان یہ فرق کا تناسب لامحدود نہیں ہونا چاہیے اور عہدہ کے اعتبار سے اعزازات، رعایتوں اور فضول رسمی تحفظات کے چونچلے ختم کردینے چاہئیں۔ اسلام جس مساوات کو چاہتا ہے، وہ یہ ہے معاشرہ کے تمام افراد کو یکساں مواقع حاصل ہوں اور مال و دولت کی کمی بیشی کے ساتھ ساتھ افراد معاشرہ کے معیارِ زندگی اور مظاہرِ معیشت میں زیادہ فرق نہ ہو۔ اسلام نے وہ تمام فرق جو محض عہدہ اور حیثیت کی بنا پر قائم کیے جاتے ہیں، ان کو مٹا دیا اور صرف نام نہاد مساوات کی جگہ حقیقی تمدنی مساوات اور معاشی انصاف قائم کیا ہے۔

معاشرہ میں سرمایہ کی صحیح گردش کا دوسرا میدان کاروبار اور تجارتی لین دین ہے جو عام لوگوں کے درمیان قائم ہوتا ہے۔ معاصر دنیا میں اس سلسلے میں دو نظریے پائے جاتے نہیں ہیں: ''ایک قومی ملکیت کا نظریہ'' اور دوسرے بے قید ملکیت یا بالفاظ دیگر ''سرمایہ داری کا نظریہ''۔ قومی ملکیت کے نظریہ کے تحت اسٹیٹ کے تمام کاروبار کو قومی ملکیت بنا کر قومی ملکیت میں دے دیے جاتے ہیں اور لوگ اپنی اپنی وسعت کے لحاظ سے کام کرتے ہیں اور پھر اس قومی ملکیت سے اپنا حصہ پاتے ہیں۔ قومی ملکیت کا نظام سوویت روس میں بزور اور بہت جوش و جذبہ کے ساتھ نافذ کیا گیا؛ لیکن غیر فطری ہونے کی وجہ سے ناکام ہوگیا۔

دوسری طرف ''سرمایہ دارانہ نظام'' میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بے روک ٹوک اپنی آمدنی مسلسل بڑھاتا چلا جائے۔ اس پر نہ اخلاقی کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے مال میں غریبوں کو کچھ دے اور نہ اس پر ایسی کوئی پابندی ہوتی ہے کہ وہ غریبوں کا مال سودی اور ناجائز ذرائع سے حاصل کرنے سے گریز کرے۔ سرمادارانہ نظام میں اصل مقصود حصولِ زر ہوتا ہے، اس میں رحم دلی، حاجت برآری اور غریب پروری کا کوئی خانہ نہیں ہے۔ اس بے قید نظامِ معیشت کا

خاصہ یہ ہے کہ جب یہ اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو دولت ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر صرف چند مٹھیوں میں جمع ہوجاتی ہے اور کاروبار پر ان کی اجارہ داری قائم ہوجاتی ہے اور عوام کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ ان مٹھی بھر سرمایہ داروں کی ملازمت کریں یا ان کے ایجنٹ بن کر ان کے کاروبار کو فروغ دیں۔

مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے دولت کا توازن ختم کردیا ہے۔ اسلامی نظام میں معاشرے میں دولت کی گردش بیع وشراء اور جائز تبادلہ پر مبنی تھی؛ لیکن مغرب کے مالی نظام کی بنیاد سود ٹھہرایا گیا جو انسانی تاریخ کے ہر دور میں غریبوں کا خون چوسنے اور کمزور کو مزید کمزور اور دست نگر رکھنے کا ذریعہ رہا ہے۔ آج اسی نظام کا نتیجہ ہے دولت چند ہاتھوں کی باندی بنی ہوئی ہے اور وہ جس طرف چاہتے ہیں دنیا کے مالی نظام کو گھما پھرا رہے ہیں۔ آج جو مال دار ہے وہ مزید مال دار ہورہا ہے اور غریب شخص غربت کے دلدل میں دھنستا چلا جارہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام لوٹ گھسوٹ کا نظام ہے، اس نظام کا خمیر ہی بخل وحرص سے اٹھایا گیا ہے۔

سود وقمار اور اسلامی نظام معیشت

اسلام نے قومی ملکیت اور بے مہار ملکیت کی دو انتہاؤں کے درمیان ایک راہِ اعتدال تجویز ہے۔ وہ انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے؛ لیکن وہ کچھ ایسی پابندیاں بھی عائد کرتا ہے؛ تاکہ دولت کی تقسیم کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ اسلام نے دولت کا یہ یک طرفہ بہاؤ کو روکنے کے لیے سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ایسے تمام کاروبار قانوناً ممنوع ہوں، جس میں ایک شخص کا فائدہ اور بہت سے لوگوں کا نقصان ہو، جیسے سود، سٹہ، جوا وغیرہ۔ اسلام نے سود کی تمام شکلوں کو حرام و ناجائز قرار دیا ہے؛ کیوں کہ سود کا نظام ایک یا چند اشخاص کے نفع کو یقینی بنانے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ سود کا مطلب یہ ہوتا ہے سرمایہ دار کے نام خوش حالی کا پٹہ لکھ دیا جائے اور اس کو ہر قسم کے خطرہ اور نقصان سے محفوظ کردیا جائے۔ دنیا کے ہر کاروبار میں نفع ونقصان کا پہلو ہوتا ہے؛ لیکن سودی قرض وہ کاروبار ہے جس میں خسارہ اور گھاٹے کا کوئی امکان نہیں۔ اس میں ہمیشہ نفع ہی ہوتا ہے۔ اگر قرض دار کنگال بھی ہوجائے تو قانون اس کے گھر کا اثاثہ بیچ کر اصل مع سود سرمایہ دار کو ادا کرتا ہے۔ اس طرح سودی معاملات کے نتیجہ میں دولت کے بہاؤ کا رخ عوام کے بجائے مٹھی بھر سرمایہ داروں کی طرف ہوجاتا ہے۔

موجودہ زمانے کا بینکنگ نظام بھی سودی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، بہ ظاہر اس میں مہاجنی

نظام یا ساہوکارانہ نظام جیسی خرابیاں نظر نہیں آتیں؛ لیکن یہ بھی دراصل چند سرمایہ دار سارے ملک کی دولت کم شرح سود پر جمع کرلیتے ہیں اور پھر زیادہ شرح سود پر اس کو کارخانہ داروں اور فیکٹری مالکان کو قرض پر دیتے ہیں۔ اور پھر وہی سامان سودی رقم کے بوجھ کے ساتھ مارکیٹ میں آتا ہے اور تمام خریدار جنھوں نے اپنا روپیہ جمع کرکے صنعتوں کے لیے سرمایہ فراہم کیا تھا، ان ہی کے ہاتھ گراں بیچ کر سود کی رقم حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح سودی معاشیات کے نتیجہ میں خود عوام سے حاصل شدہ دولت اس بات کا ذریعہ بنتی ہے کہ دولت کے بہاؤ کا رخ عوام کے بجائے چند سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی طرف ہوجائے۔ اسلام نے بینکنگ کی مخالفت نہیں کی ہے؛ کیوں کہ بینکنگ دراصل ایک سادہ سی اقتصادی تدبیر کا نام ہے۔ بڑا کاروبار کرنے کے لیے بڑا سرمایہ چاہیے، اس پہلو سے بینکنگ کی ضرورت مسلم ہے کہ عوام کا وہ پیسہ جو ان کی تجوریوں میں بند ہوتا ہے، اس سے سرمایہ کاری ہو اور اس کا نفع سب کو پہنچے۔ اس نقطۂ نظر سے اسلام کے مطابق بینکنگ کی صحیح بنیاد مضاربت ہے یعنی عوام کو اصل نفع ونقصان میں برابر کا شریک رکھا جائے۔ مضاربت تجارتی عمل میں معاون بننے کے ساتھ دولت کی گردش کو پھیلاتی ہے اور سود دولت کو سمیٹ کر چند ہاتھوں میں پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ مضاربت سے عمومی نفع کی صورت پیدا ہوتی ہے؛ جب کہ سود سے استحصال کو فروغ ملتا ہے۔

یہی حال قمار، جوے، سٹہ اور لاٹری وغیرہ کا ہے جس میں لازماً ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے فریق کا نقصان یا مٹھی بھر افراد کا فائدہ اور پورے معاشرہ کا نقصان ہے۔ یہ کاروبار کچھ لوگوں کے لیے سماج کی کسی حقیقی خدمت کے بغیر روپیہ کا ڈھیر لگا دیتا ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں کو کسی بنیادی سبب کے بغیر مفلس اور کنگال بنا دیتا ہے۔

اسلام کا نظام زکوۃ ووراثت

دولت کی صحیح تقسیم قائم رکھنے اور معاشرہ میں مساوی گردش کو یقینی بنانے کے مقصد سے زکاۃ فرض کی گئی، جس کا اصول ہے کہ مال داروں سے وصول کی جائے اور غریبوں کو ادا کی جائے۔ اسلام غنی اور مال دار کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنا زائد اور اضافی مال راہِ خدا میں خرچ کرکے اللہ تعالی کی رضا حاصل کرے اور اخلاقی عظمت حاصل کرے۔ قرآن کریم میں ہے: فِیْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (سورۃ المعارج، آیت ۲۴، ۲۵)

اسلام نے ہر قسم کی ملکیت کا ایک معیار مقرر کردیا ہے، جس کے پاس بھی اس معیار سے

زیادہ دولت پائی جائے گی اس سے ہر سال زکاۃ کا لازمی حصہ وصول کیا جائے گا۔ زکاۃ اسلامی معاشیات کا عظیم الشان انقلابی باب ہے۔ اگر کوئی ملک صحیح معنوں میں اسلامی نظامِ زندگی کو قبول کر کے نافذ کرلے تو وہاں افلاس، گداگری اور دیگر معاشی جرائم کا خاتمہ ہوجائے گا۔ نظام زکاۃ دولت کے سمٹاؤ کو روک کر اس کا بہاؤ معاشرہ کے کمزور افراد کی طرف کردیتا ہے۔

علاوہ ازیں، صدقات وخیرات کی خوب ترغیب دی گئی اور مختلف قسم کے کفارات اور فدیوں کی ایسی صورت تجویز کی گئی جس سے غریب افراد کی حاجت روائی کا سامان بھی پیدا ہوگیا۔ اسلام میں اخلاقی حیثیت سے بخل کو سخت قابلِ مذمت قرار دیا گیا۔ سخاوت وفیاضی بہترین صفت قرار دی گئی۔

اسی نظامِ معیشت کے پیش نظر میراث کا ایسا قانون بنایا گیا کہ ہر مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دولت اور جائداد زیادہ سے زیادہ وسیع دائرہ میں پھیل جائے اور معاشرہ کے زیادہ سے زیادہ افراد اس سے مستفید ہوں۔

اسلام کا نظامِ تکافل

اسلام کا نظامِ تکافل اسلامی معاشی انقلاب کا اہم حصہ ہے جس میں کسی مذہب وقومیت کے امتیاز کے بغیر ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کو کسی نہ کسی شکل میں اتنا سامان معاش ہر حال میں میسر ہوجائے جتنا اطمینان کے ساتھ عام زندگی گزارنے اور متعلقہ حقوق وفرائض کی ادائیگی کے لیے ایک انسان کو درکار ہوتا ہے۔ اس نظام کا مقصد ملکی وقومی دولت کی گردش کا دائرۂ کار چند اغنیاء مال دار لوگوں کے درمیان محدود ہونے سے بچانا ہوتا ہے؛ تاکہ عام لوگ کسی کے رحم وکرم کے محتاج نہ رہیں۔ اسلام کا حکم ہے کہ معاشرے کے وہ افراد جو مسکین اور نادار ہوں، یا کسی عذر کی وجہ سے معذور ہوں اور کوئی معاش تلاش کرنے یا روزی کمانے کے لائق نہ ہوں یا مناسب روزگار نہ ملنے کی وجہ سے محتاجی کا شکار ہوں تو ایسے ضرورت مند افراد کی معاشی کفالت حکومت کی اولین ذمہ داریوں میں سے ہے۔ اسی طرح جو ان کے عزیز واقارب ہوں، ان کے ذمہ ایسے افراد کی کفالت ہے اور معاشرہ کے دیگر مال دار لوگوں کو زکاۃ وصدقات اور عطیات سے ایسے افراد کی کفالت کا انتظام کریں۔ اسلام کے نظامِ تکافل میں اولیت اس بات کو حاصل ہے کہ اسلامی ریاست کا کوئی شخص بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ ہو۔ اس نظام میں امیر کو ترغیب دے کر اور آخرت کا خوف دلا کر یہ درس دیا جاتا ہے کہ وہ غریب اور محروم افراد تک اس کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔

خلاصۂ کلام

اسلام کا یہی انقلابی نظامِ معاش ہے جو ظہورِ اسلام کے بعد دنیا میں رائج ہوا پوری شان کے ساتھ تیرہ صدیوں تک چلا۔ اس نظام کے زمانے میں انسانوں کو کبھی بھی کوئی بڑا معاشی بحران نہیں پیش آیا۔ تمام لوگوں کے درمیان دولت کی تقسیم اور اس کا توازن قائم رہا۔ مختلف اسلامی حکومتوں کے زمانے میں عوام الناس کی معاشی فارغ البالی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ مسلمان ملکوں کی معاشی بہتری اور دولت کی ریل پیل ہی وہ وجہ ہے جس کی بنیاد پر مشرق کے اسلامی ممالک مغرب کے سرمایہ دار اور استعماری ملکوں کا نشانہ بنے اور آج بھی وہ اس سے نجات نہیں پا سکے ہیں۔

اسلامی نظام میں ہر ملک اور خطہ کے لوگوں کو مقامی سطح پر معاش اور رزق کے ذرائع مہیا تھے اور انھیں اس کے لیے نقلِ مکانی کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی؛ لیکن آج دنیا میں سب سے زیادہ نقلِ مکانی معاشی ضرورتوں کی بنیاد پر ہو رہی ہے اور لاکھوں افراد ادھر سے ادھر منتقل ہو رہے ہیں۔ بے جا معاشی ضروریات کی وجہ سے لوگ زندگی کے حقیقی آرام سے محروم اور ترفہ وعیش کے سامانوں کی کثرت کے باوجود ذہنی سکون کی دولت سے ناآشنا ہیں۔

مغربی نظام سے دولت کی بے جا ہوس لوگوں کے دلوں میں پیدا کر رکھی ہے اور دنیا کی چمک دمک دکھا کر لوگوں کو ہر جائز وناجائز ذرائع سے دولت کمانے پر اکسا رہا ہے۔ مغرب نے مشین ایجاد کر کے ملک کے مال دار ایک معمولی طبقہ کو ساری دولت کا مالک بنا دیا اور بقیہ پورے معاشرہ کو اس کا نوکر۔ ایک شخص جس کے پاس بے انتہا دولت ہے وہ فیکٹری لگاتا ہے اور پوری قوم اس کے یہاں نوکری کرتی ہے۔ عوام الناس اپنی محنت سے جو سامان تیار کرتے ہیں، اس کے منافع کا بڑا حصہ خود ایک مالک کے ہاتھ چلا جاتا ہے اور اس کا ایک معمولی ٹکڑا معاشرے کے ایک بڑے حصہ میں تقسیم ہوتا ہے جو اس کی محنت کا عُشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا۔

اسلامی معاشرہ میں عام پبلک اور حکم رانوں کے درمیان سیاسی اختیارات کے سوا اور کسی حیثیت سے کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک عام شخص کے جو شہری حقوق ہوتے تھے، وہی بڑے سے بڑے عہدہ دار کے ہوتے تھے۔ سرکاری خزانوں سے وزیروں اور گورنروں کو اتنا ہی حصہ ملتا جتنا عام شہریوں کو۔ یہی وجہ تھی کہ ملک کی دولت معاشرہ کے تمام افراد تک یکساں پہنچتی تھی اور ہر طرف خوش حالی کا دور دورہ تھا؛ چناں چہ عرب میں یہ حال پیدا ہو گیا کہ شہروں میں لوگ صدقات کی رقمیں لیے پھرتے تھے اور کوئی اسے لینے والا نہیں ملتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند اور اردو زبان

از: مولوی فاروق اعظم قاسمی
ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

۱۸۵۷ء کی ہزیمت کے بعد دارالعلوم دیوبند اسلامیانِ ہند کے لیے نشأۃ ثانیہ ثابت ہوا اور اس عرصے میں اس نے اپنی دینی، علمی، قومی اور ملی خدمات کی بنا پر دنیا بھر میں شہرت ومقبولیت حاصل کی۔ بلاشبہ قیامِ دارالعلوم دیوبند کا مقصد مسلمانوں کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یکجا کرنا اور اسلامی تشخص کے ساتھ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانا تھا جس میں اسے کامیابی ملی؛ لیکن اسی کے متوازی دارالعلوم نے بہت سے ایسے کارنامے بھی انجام دیے جس کے لیے وہ معروف نہیں ہے۔ یہ امر مبنی برحقیقت ہے کہ اس عظیم ادارے نے زبان وادب کے میدان میں بھی غیر معمولی کردار ادا کیا ہے بہ طور خاص اردو زبان کی توسیع وترویج اور تحفظ وبقا کی خاطر اس کی شعوری کوششوں سے اردو زبان کا کوئی بھی انصاف پسند مورخ انکار نہیں کرسکتا؛ لیکن افسوس! ہنوز ایسے مورخ کا انتظار باقی ہے۔

اہلِ نظر اس نقطے سے بہ خوبی واقف ہیں کہ کوئی بھی زبان ایک دن میں زبان نہیں بن جاتی۔ اس کے پیچھے صدیوں کا وقت اور کروڑوں انسانی اذہان کی مشترکہ جدوجہد کارفرما ہوتی ہے۔ انسانی ضروریات کے پیشِ نظر اشارات کا صوتیات میں اور صوتیات کا لفظیات کے روپ میں ڈھل کر مسندِ قرطاس پر براجمان ہونے کا نام زبان ہے۔ زبان کی حیثیت درخت کے تنے کی سی ہے اور ادب اس کی شاخیں، پتے اور پھول وپھل ہے؛ جب تک کسی زبان کی بنیاد مضبوط نہیں ہوجاتی اس وقت تک ادب کا تصور محال ہے؛ اس لیے زبان کا درجہ ادب سے مقدم ہے۔

قدیم دلی کالج (مدرسہ غازی الدین) کے دو فاضل اور مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے شاگرد سر سید احمد مرحوم اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دو الگ الگ ادارے قائم کیے۔ بہ ظاہر دونوں اداروں کی نوعیت تعلیمی تھی اور دونوں کے بنیادی مقاصد بھی تقریباً ایک تھے یعنی مسلمانوں کو ہر طرح کی پسماندگی سے باہر نکالنا، خواہ دینی، تعلیمی پسماندگی ہو یا معاشی یا پھر کسی حد تک سیاسی بھی؛ البتہ منزل تک پہنچنے کے راستے دونوں کے الگ الگ تھے۔ دونوں کے طریقہائے کار اور ترجیحات میں فرق تھا۔ جس

طرح علی گڑھ کی اسلامی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اسی طرح دیوبند کی لسانی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

دیوبند کا دائرۂ کار بہت وسیع ہے۔ دین و مذہب اور اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ سماج و سیاست کے باب میں بھی اس ادارے کا نمایاں کارنامہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، محدثِ عصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، مفتی محمد شفیع عثمانیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مفتی کفایت اللہؒ، علامہ سید مناظر احسن گیلانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ، مولانا منت اللہ رحمانیؒ، قاری محمد طیب قاسمیؒ اور قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ وغیرہ کے نام انتہائی روشن اور قابلِ ذکر ہیں۔

اردو ذریعۂ تعلیم:

دیوبند اور اس کے ہم نصاب مدارس جن میں سے تین ہزار مدارس تو باضابطہ رابطۂ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کے ممبر ہیں۔ اول روز سے ان تمام مدارس کا ذریعۂ تعلیم اور دفتری زبان اردو ہی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی جملہ تحریری کاروائی آغاز سے آج تک اردو ہی میں ہوتی ہے۔ کتب خانہ، محاسبی، دفترِ تعلیمات اور دیگر دفاتر کے سرکلر، تمام اعلانات اور الف سے یا تک تمام کاغذی کاروائی اردو زبان ہی میں ہوتی ہے۔ اسی طرح سہ ماہی، ششماہی، سالانہ اور داخلے کے امتحانات پھر ان کے تمام سوالات کے پرچے اردو زبان ہی میں ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ دارالعلوم کی سیکڑوں صوبائی و ضلعی انجمنوں کی پنچانوے فی صد سرگرمیاں اردو ہی میں انجام پاتی ہیں۔ ان انجمنوں کی سرگرمیوں کی تین بنیادی شاخیں ہوتی ہیں: ہفتہ وار تقریری پروگرام، مطالعہ (لائبریری) اور دیواری پرچے۔

اردو زبان کی قرأت کے حوالے سے بات کی جائے تو یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بہت حوصلہ افزا ہے۔ دارالعلوم میں اردو زبان کا استعمال اس طرح ہوتا ہے کہ یہاں ننانوے فی صد اخبارات و رسائل اردو زبان ہی کے پڑھے جاتے ہیں؛ ممکن ہے دہلی سے شائع ہونے والے بعض اردو اخبارات آپ کو دہلی میں نہ ملیں یا تاخیر سے ملیں؛ لیکن دیوبند، بہ طورِ خاص دارالعلوم کے اردگرد دکانوں پر علی الصباح اردو کے تمام معروف اخبارات آپ کو دستیاب ہوں گے۔

اردو کا عام استعمال:

کسی بھی زبان سے محبت اور اسے ترویج دینے کا اندازہ اس زبان میں تعلیم و تعلم کے ساتھ عوامی

مقامات سے بھی لگایا جاسکتا ہے؛ چناں چہ دیوبند کے سائن بورڈ کی زبان، مختلف پروگراموں کے بینرز کی زبان، اساتذہ کے ناموں کی تختیوں (نیم پلیٹس) کی زبان، سڑکوں کے ناموں کی زبان اور مزاروں کے کتبوں کی زبان اردو ہی ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں کے کلینڈر، مُہر، شادی اور دیگر تقریبات کے دعوت نامے بھی اردو زبان میں ہوتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر بھی دیوبند کے بہت سے فضلاء موجود ہیں۔ نیوز پورٹل، بلاگ، ٹیوٹر، فیس بک اور واٹس ایپ وغیرہ پر بڑی خوش اسلوبی سے اردو کا استعمال ہو رہا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات بغیر کسی حجاب اور جھجک کے اردو کی اس خدمت میں مصروف و منہمک ہیں۔ اردو زبان سے دیوبند کے لگاؤ کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ دیوبند نے اردو کی جو خدمت کی یا کر رہا ہے اس کی بنیاد صلۂ وستائش کے بجائے خلوص پر ہے۔ اردو سے دیوبند کا یہ تعلق کسی مجبوری کی بنیاد پر نہیں؛ بلکہ اختیاری اور شعوری ہے۔ یہاں کے فضلاء اردو شان سے بولتے ہیں نہ کہ لاجے شرمے۔ یہاں اردو دانوں کے بیچ اردو پروگراموں میں اردو موضوع پر اگر گفتگو کا موقع ہوتا ہے تو اردو زبان ہی میں گفتگو کی جاتی ہے نہ کہ انگلش یا کسی اور زبان میں۔ مولانا عبدالحمید نعمانی نے بڑی اچھی اور سچی بات کہی ہے: ''مدارس میں کم از کم یہ تضاد دیکھنے میں نہیں آتا ہے کہ اردو والے کے سامنے کسی اور زبان میں اظہارِ خیال کیا جائے۔ خالص اردو کے فروغ کے لیے قائم اداروں کے پروگراموں میں انگریزی و دیگر زبانوں میں تقریر یا مقالے کی خواندگی پوری سعادت مندی سے کی جارہی ہے۔'' (ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی، مئی ۲۰۱۳ء، ج:۱۵، ش:۵)

اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے ہی کا صدقہ ہے کہ دیوبند نے جہاں اردو کو ہر لمحے اپنے ساتھ رکھا اسی طرح ملکی و عالمی سطح پر بھی اس زبان کی آبیاری کی۔ ملک کے طول وعرض اور ایسے خطے سے آنے والے طلبہ جن کی مادری زبان اردو نہیں ہوتی تھی انھیں بھی دیوبند نے اردو زبان کا عمدہ تحفہ عطا کیا۔ تعلیم کا میڈیم جو زبان ہوتی ہے اس کی ترقی کی رفتار یا اس کی ترویج واشاعت کے امکانات کس قدر روشن ہوتے ہیں، اس نکتے کو سمجھنا موجودہ عہد میں زیادہ مشکل نہیں۔

اردو کی قومی حیثیت:

دارالعلوم کی شہرت ومقبولیت کے پیشِ نظر ملک کے گوشے گوشے سے تشنگانِ علم ومعرفت جوق در جوق یہاں آنے لگے۔ یہ طلبہ اپنی مادری زبان: بنگلہ، تمل، ملیالم، کنڑ، تلگو، کشمیری، اڑیا، گجراتی، آسامی، مراٹھی پشتو، فارسی اور انگریزی وغیرہ بولنے کے باوجود دیوبند سے اچھی خاصی اردو سیکھ کر جاتے؛ بلکہ اس میں مہارت پیدا کر کے اپنے وطن لوٹتے ہیں پھر اردو کی روشنی ان علاقوں میں پھیلے بغیر نہ رہتی۔ آج اگر ان علاقوں میں اردو بولنے یا سمجھنے والے ہیں تو اس میں ایک بڑا حصہ دیوبند کا

بھی ہے۔اس سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی 'بہشتی زیور' کا ذکر کیے بغیر بھی بات نہیں بنتی۔ حضرت تھانویؒ کی یا ان کی نگرانی میں تیار کردہ، مسلم خواتین کا یہ ایک معروف ومقبول انسائیکلو پیڈیا ہے۔ ملکی سطح پر ہی سہی اردو زبان کی توسیع وترقی میں اس کتاب کا بھی بڑا اہم رول رہا ہے۔اسے بیٹیوں کو جہیز میں دینے کو عقیدت مندی کا نام تو دیا جاسکتا ہے؛ لیکن اپنے مشمولات کے پیشِ نظر اردو زبان میں مسلم عورتوں کی روزمرہ کی ضروریات کے بہ طور بلاشبہ یہ ایک انمول تحفہ ہے اور گزشتہ ایک سو سترہ اٹھارہ برسوں سے اس خدمت پر بلا کسی وقفے کے مامور ہے۔اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا آغاز اردو کے حروف تہجی سے ہوتا ہے؛ تاکہ جو اردو سے ناواقف بھی ہو تو اردو سیکھ کر اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکے۔بہشتی زیور کے بارے میں عارف اقبال لکھتے ہیں: ''بہشتی زیور (۱۳۲۰ھ) نسائی ادب میں بلاشبہ اپنے وقت کی اہم کتاب ہے جو تقریباً ۱۱۶ برس قبل شائع ہوئی تھی جس کی اشاعت تسلسل کے ساتھ آج تک ہو رہی ہے۔اس کتاب کو اپنے عہد کی خواتین کا انسائیکلو پیڈیا کہا جاسکتا ہے۔'' (سہ ماہی 'اردو بک ریویو' دہلی، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۳ء، مشترک شمارہ)

حضرت تھانویؒ کے علاوہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، کا ترجمہ قرآن (مدینہ پریس بجنور، ۱۹۲۳ء) مفتی شفیع عثمانیؒ کی تفسیر 'معارف القرآن' (۱۹۷۲ء کراچی) مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی 'تفسیر ثنائی، مولانا منظور نعمانیؒ کی 'اسلام کیا ہے؟ (۱۹۵۲ء) مفتی کفایت اللہؒ کی تعلیم الاسلام اور مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی 'دینی تعلیم کا رسالہ' وغیرہ انتہائی مقبولِ عام وخاص ہیں۔ان سب کی زبان اردو ہی ہے اور گزشتہ نصف یا نصف صدی سے زیادہ عرصے سے شائع ہو رہی ہیں اور تا حال جاری و ساری ہیں۔

اسی طرح دیوبند کی تاسیس کے چند سال بعد ہی یہاں بیرونِ ممالک سے بھی طلبہ کی آمد شروع ہوگئی تھی۔دارالعلوم میں قیام کے دوران نہ صرف یہ کہ وہ طلبہ اردو بولنا سیکھ جاتے تھے؛ بلکہ اس زبان کے عمدہ خطیب، بہترین قلمکار اور غیر اردو داں بستیوں میں اس زبان کی تبلیغ کا شاندار کارنامہ بھی انجام دیتے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

دارالعلوم میں اردو کے ذریعۂ تعلیم ہونے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا بہ قولِ حقانی القاسمی: ''دیگر لسانی معاشروں سے تعلق رکھنے والے بھی اردو زبان میں ہی تعلیم پاتے، چاہے ان کا تعلق برمی، بنگلہ، کنڑ، تمل، تلگو، گجراتی، مراٹھی زبان سے ہو؛ مگر مدارس کے طلبہ اردو زبان کے ذریعے ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔'' (ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی، مئی ۲۰۱۳ء، ج:۱۵،ش:۵)

دارالعلوم دیوبند نے اپنے قیام کے چند برسوں بعد ہی مرکزیت حاصل کرنے میں کامیابی

حاصل کر لی تھی اور ملک و بیرون ملک کے تشنگانِ علم ومعرفت بڑی تیزی سے دیوبند آنے لگے تو ابتدا میں کتابوں کی ضرورت کی تکمیل دہلی اور لکھنؤ سے ہوتی رہی؛ لیکن طلبہ کی روز افزوں بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر درسی وغیر درسی کتابوں کی ضرورت بھی شدت سے محسوس کی جانے لگی۔

اردو کے اشاعتی ادارے:

اسی احساسِ ضرورت کی تکمیل کی غرض سے ابتدا میں مفتی شفیع عثمانیؒ نے 'دارالاشاعت' اور حضرت نانوتوی کے پوتے مولانا محمد طاہر قاسمی نے 'مطبع قاسمی' کی بنیاد ڈال کر اشاعتی حوالے سے اردو کی ترویج وتوسیع کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی اشاعتی ادارے فضلائے دیوبند کے ہاتھوں قائم ہوئے اور اس سلسلے میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ اسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آزادئ ہند کے بعد دیوبند کے اشاعتی کتب خانوں کے ساتھ ان کے مالکان نے اپنے اپنے چھاپے خانے اور پریس بھی قائم کیے۔ مولانا شوکت خان کا 'نیشنل پریس'، مولانا شوکت دیوبندی کا 'آزاد پریس' اور قاضی انوار کا 'محبوب پریس' انتہائی قابلِ ذکر ہیں۔ ایسے ہی مولانا راشد عثمانی کا 'راشد اینڈ کمپنی'، مولانا اسحاق دیوبندی کا 'کتب خانہ رحیمیہ'، مولانا نعیم دیوبندی کا قائم کردہ 'کتب خانہ نعیمیہ'، مولانا سید احمد کا 'کتب خانہ اعزازیہ' اور مولانا عامر عثمانی کا 'مکتبہ تجلی' وغیرہ کا شمار دیوبند کے اولین اشاعتی اداروں میں ہوتا ہے، نہ صرف یہ کہ ان اداروں کو تقدم حاصل ہے؛ بلکہ اپنی کثرتِ اشاعت میں بھی معروف ہیں۔ موجودہ عہد میں مولانا ندیم الواجدی کا یاسر ندیم پریس اور فیصل مہدی صاحب کا یونین پریس بھی اہمیت کا حامل ہیں۔ اس وقت خاص طور پر مولانا ندیم الواجدی کا 'دارالکتاب'، مولانا صدرالزماں قاسمی کا 'کتب خانہ حسینیہ' اور مولانا سید شاداب حسین قاسمی کا 'اتحاد بک ڈپو' اپنی منصوبہ بندی کے ساتھ کتابوں کے معیار اور کثرتِ اشاعت کے لیے مدارس کے حلقوں میں خاصا مشہور ہیں۔

کچھ فضلا ایسے بھی ہیں جنھوں نے محض اپنی کتابوں کی اشاعت کے لیے کتب خانے قائم کیے۔ ایسے اداروں میں مولانا قاری رفعت قاسمی کا 'مکتبہ رضی'، 'مولانا نور عالم خلیل امینی کا 'ادارۂ علم وادب'، مولانا عبداللہ جاوید کا 'ادارۂ اسلامیات'، مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کا 'بیت الحکمت' مولانا جمال کا 'مکتبہ جمال'، مولانا حسین احمد ہردواری کا 'مکتبہ الاطہر'، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا 'مکتبہ البلاغ' اور مولانا ریاست علی بجنوری کا مکتبہ مجلس قاسم المعارف یا کاشانۂ رحمت وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ کچھ ادارے ایسے بھی ہیں جہاں سے مالکانِ ادارہ کی کتابوں کے ساتھ دیگر کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ ایسے اشاعتی کتب خانوں میں مفتی سعید احمد پالن پوری کا 'مکتبۂ حجاز'، مفتی امین پالن پوری کا 'الامین کتابستان'، قاری ابوالحسن اعظمی کا 'مکتبہ صوت القرآن'، مولانا جمیل احمد سکروڈوی کا 'مکتبہ البلاغ'

مولانا ساجد قاسمی اور مولانا عبدالقدوس قاسمی کا 'دارالمعارف' اور مفتی محمد یوسف تاؤلوی کا 'مکتبہ فقیہہ الامت' قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ مکتبہ ملت، زمزم بک ڈپو، مکتبہ مدنیہ، دارالاشاعت، سنابل کتاب گھر وغیرہ کے مالکان بھی دیوبند ہی کے فضلا ہیں۔ ان اداروں کے علاوہ اور بھی کئی کتب خانے بہت اہم ہیں ان میں، زکریا بک ڈپو، مکتبہ تھانوی اور فیصل پبلی کیشنز بڑی شہرت رکھتے ہیں ان کا بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ رشتہ دارالعلوم سے ضرور ملتا ہے۔

دارالعلوم کے بھی اپنے دو اشاعتی ادارے ہیں ایک 'مکتبہ دارالعلوم'، دوسرا 'شیخ الہند اکیڈمی' (جو دراصل دارالعلوم کا ایک تحقیقی اور تربیتی شعبہ ہے) ہے۔ ان اشاعتی اداروں سے شائع ہونے والی کتابوں کا اسی فی صد یا اس سے بھی زائد حصہ اردو زبان میں ہوتا ہے۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ تقریباً ستر فی صد کتابوں کا تعلق درسیات (مدارس) سے ہوتا ہے اور تیس فی صد میں علمی، تاریخی، سوانحی، اصلاحی اور ادبی موضوعات سے متعلق کتابیں ہوتی ہیں۔ ادبی کتابوں میں سب سے زیادہ غیر افسانوی نثری کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ مثلاً: سوانح وسیرت، سفرنامے، خاکے اور مکتوبات۔ اس کے بعد شعری مجموعوں کا نمبر آتا ہے اور افسانہ، ناول اور ڈرامے سے متعلق کتابوں کی اشاعت ایک آدھ فی صد ہی ہو پاتی ہے۔ ان مطابع اور پریسوں اور اشاعتی اداروں نے اردو کتابیں چھاپ کر ملک و بیرونِ ملک کے چپے چپے تک پہنچانے کا جو عظیم کام انجام دیا ہے، اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اردو اور خوش نویسی:

اسی طرح خطاطی کے ذریعے بھی دیوبند نے اردو زبان سے لوگوں کو قریب کیا ہے۔ ویسے تو براہِ راست زبان وادب سے اس فن کا تعلق نہیں، یہ فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ ہے تاہم اس کا سرا زبان و ادب سے بھی ضرور ملتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کے اندر خوش نویسی کی قوت پیدا کرنے کی غرض سے ۱۹۴۷ء میں 'شعبۂ خوشخطی' کا قیام عمل میں آیا۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج:۱،ص:۱۳۲) اس شعبے نے طلبہ کے اندر خوش نویسی کا شوق پیدا کرنے کے علاوہ بہ طورِ فن کے بھی اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ مولانا یوسف عظیم آبادی، مولانا اسلام قاسمی، مولانا ساجد الاعظمی، انیس صدیقی، سابق صدرِ شعبہ مولانا نیاز الدین اصلاحی، مولانا کفیل الرحمٰن اور شعبۂ مذکور کے موجودہ صدر مولانا عبدالجبار قاسمی وغیرہ ایسے بے شمار فضلا نے خطاطی (Callygraphy) کا فن سیکھ کر دنیا بھر میں اپنے نام کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے نام کو بھی روشن کیا اور ساتھ ہی اردو زبان کے حسن کو بھی دوبالا کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے

فن کا شاہکار پیش کر کے اردو رسمِ خط کے حسن میں زبردست اضافہ کیا اور اس کی روشنی وخوشبو پوری دنیا میں پھیلائی۔ ملک و بیرون ممالک کی بے شمار مساجد کی پیشانیوں پر ان کی خطاطی کے اعلیٰ نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم نام طارق ابنِ ثاقب کا ہے۔ کولکاتا، گجرات اور پونے وغیرہ کی درجنوں مساجد کے علاوہ امریکہ، افریقہ اور کناڈا تک میں ان کے فن کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس فن کے ذریعے بھی اردو نے دور دراز کا سفر طے کیا، اجنبیوں کو خود سے قریب کیا اور قلب و نظر کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچایا۔

اردو اور طبِ یونانی:

طبِ یونانی کا عربی وفارسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی بڑا گہرا رشتہ رہا اور ہے۔ اس فن کی بہت سی کتابیں اسی زبان میں لکھی گئیں اور اس کا ذریعۂ تعلیم بھی اردو کو بنایا گیا۔ ایسے ہی ہندوستان کے بہت سے اطبار نے اپنے دیگر طبی امور بھی اسی زبان میں انجام دیے؛ بلکہ ان کے تجویزی نسخے کل بھی اردو میں ہوتے تھے اور آج بھی نسخے کی زبان اردو ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طبِ یونانی کی تمام دواؤں کے نام فارسی یا عربی نما اردو میں ہوتے ہیں اور اس کی تیار کردہ دواؤں اور دیگر ٹانکوں پر جلی حرفوں میں متعلقہ دواؤں کے نام اردو زبان میں بھی درج ہوتے ہیں۔ ہمدرد اور ریکس (دوا کمپنی) وغیرہ کی مصنوعات سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس وضاحت سے طبِ یونانی کا اردو زبان سے تعلق کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔

دیوبند نے اپنے قیام کے صرف ۱۳ سال بعد ۱۸۷۹ء میں طب کی تعلیم کا آغاز کر دیا تھا اور ۱۸۸۴ء میں طب کا باضابطہ شعبہ قائم ہوا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب نہ ہمدرد دواخانہ (۱۹۰۶ء) قائم ہوا تھا اور نہ ہی جامعہ ہمدرد (۱۹۸۹ء)۔ ۱۹۵۵ء میں دارالشفا کی علیٰحدہ عمارت تعمیر ہوئی اور ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں مستقل جامعہ طبیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس جامعہ کا ذریعۂ تعلیم اردو زبان تھا اور نظری وعملی ساری کاروائی بھی اسی زبان میں ہوتی تھی۔ مختلف شعبہ جات کے لحاظ سے دیوبند کی صد سالہ خدمات کے ضمن میں سید محبوب رضوی مرحوم نے جامعہ طبیہ کے فضلا کی تعداد ۲۸۸ درج کی ہے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج:۱،ص:۴۴۵) دارالعلوم کے ایک ابتدائی دور (۱۳۰۰ھ) کے نابینا فاضل حکیم عبدالوہاب جو حکیم نابینا سے معروف تھے، ڈاکٹر مختار انصاری مرحوم کے بڑے بھائی تھے، دہلی سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی، بڑے ماہر نباض تھے، علم النبض پر ''اسرارِ شریانیہ'' نامی ایک معرکہ آرا کتاب تحریر کی۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج:۲،ص:۶۱) اسی طرح ایک اور فاضلِ دیوبند، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلمار لکھنؤ کے بڑے بھائی حکیم عزیز الرحمٰن نے

بھی ۲۳ سال دارالعلوم دیوبند میں طب کا درس دیا اور 'امراضِ صدر'، 'کتاب الرحمت' اور بارہ سو صفحات پر مشتمل دو ضخیم جلدوں میں اردو انگلش طبی لغت جیسی قیمتی تصانیف کے ذریعے طبِ یونانی اور اردو کو ہم رشتہ کیا۔ (پسِ مرگ زندہ، نور عالم خلیل امینی، ادارۂ علم و ادب دیوبند، (۲۰۱۰ء دوسرا اڈیشن، ص: ۹۱۱) ان فضلاء نے جہاں ایک طرف ملک بھر میں عوامی خدمات انجام دیں وہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ اردو زبان کے فروغ میں بھی ان کا اہم حصہ رہا۔

اردو کی عالمی حیثیت:

دیوبند نے نہ صرف یہ کہ ملک کے غیر اردو معاشرے تک اردو کی روشنی پھیلائی؛ بلکہ عالمی سطح پر بھی دیوبند نے اپنے فضلاء کے ذریعے اردو کی خوشبو کو دنیا بھر میں بکھیرنے کا روشن کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کے کئی محرکات ہیں۔ سب سے پہلے تو دیوبند کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے جس کے نتیجے میں بلا کسی امتیاز کے یہاں کا ہر فاضل خواہ ہندوستانی ہو غیر ہندوستانی اردو بولنے، پڑھنے، سمجھنے اور لکھنے پر قادر ہوتا ہے یا کم از کم بولتا اور سمجھتا تو ضرور ہے۔ دوسری بنیادی وجہ دیوبند کے ذریعے عالمی تبلیغی تحریک کا برپا ہونا ہے۔ اس عالمی تحریک نے عملی طور پر اردو زبان کو جو عالمگیریت عطا کی ہے، اس سے شاید دیگر تحریکاتِ اردو بھی محروم ہیں۔ گزشتہ نوے سالوں سے اس تحریک نے دنیا بھر کے محلے محلے اور گلی گلی میں تبلیغِ اسلام کا ایک انقلابی کارنامہ انجام دیا ہے اور ساتھ ہی اردو کو ایک عمومیت بھی عطا کی۔

''جنوبی افریقہ میں اردو'' کے تحت پروفیسر حبیب الحق کے حوالے سے حقانی القاسمی نے لکھا ہے:

''ڈربن میں پانچ عظیم مراکز ہیں جہاں اردو زبان ذریعۂ تعلیم ہے۔ درجنوں مدارس ہیں جن کے اساتذہ زیادہ تر ہندوستانی مدارس، مثلاً دیوبند، راندیڑ، ڈابھیل کے فارغین ہیں۔'' (دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ، حقانی القاسمی، آل انڈیا تنظیم علمائے حق، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص: ۴۸)

اس سلسلے میں پروفیسر سعود عالم قاسمی نے بھی اپنے مشاہدے کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستانی مدارس کے فضلاء کی دینی، تعلیمی، ثقافتی، معاشی، سیاسی اور لسانی سرگرمیوں کو بیان کرتے ہوئے وہاں کے چار معروف مدارس: 'دارالعلوم زکریا' جوہانس برگ، 'جامعہ اسلامیہ' آزادول جوہانس برگ، 'دارالعلوم مسیح الامت' روشنی جوہانس برگ اور 'دارالعلوم' نیوکاسل کا بہ طورِ خاص تذکرہ کیا ہے۔ اسی ضمن میں وہ لکھتے ہیں: ''ان مدارس میں ابتدائی تعلیم سے لے کر دورۂ حدیث، افتاء اور تخصص فی الحدیث کی تعلیم ہوتی ہے، یہاں کے مقامی طلبہ کی مادری زبان اردو نہیں ہے؛ مگر حدیث پڑھنے والے تمام طلبہ کو پہلے اردو زبان سیکھنی ہوتی ہے۔ ان مدارس کے بیشتر اساتذہ دارالعلوم دیوبند یا دارالعلوم کراچی کے فضلاء ہیں اور یہ عربی کے ساتھ اردو میں تعلیم دیتے ہیں۔'' (اردو کے فروغ میں مدارس کا کردار، مرتب:

عبدالمعید قاسمی ،فلاح المسلمین الٰہ داد پور سمیتی ، فتح پور ،۲۰۱۳ء ،ص: ۴۱-۴۰) اسی طرح اردو کے حوالے سے دیوبند کا فیض یوروپی ممالک ، برطانیہ، امریکہ اور سعودی عرب وغیرہ میں بھی پہنچا اور آج بھی دیوبند کے فضلاء اردو کی روشنی دنیا بھر میں پھیلا رہے ہیں۔

فاضلِ دیوبند مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ جو جماعتِ تبلیغ کے بانی ہیں۔ان کی اس تحریک نے بھی اردو زبان کو دنیا بھر میں رابطے کی زبان بنانے کا ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے۔اس وقت فضلائے دیوبند کے ہاتھوں قائم ہونے والی کسی بھی تحریک میں سب سے فعال اور اردو زبان کو استعمال کرنے والی بین الاقوامی جماعت یہی ہے۔ جو ۱۹۲۷ء سے باضابطہ مصروفِ کار ہے۔حقانی القاسمی رقم طراز ہیں: ''اس ضمن میں محمد الیاس کاندھلویؒ کی عالمی تبلیغی تحریک کا ذکر بھی ضروری ہے جس نے زبان کی حد تک اردو کے فروغ میں اردو کی باضابطہ تنظیموں ،اداروں سے زیادہ فعال اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ صرف ایشیا، افریقہ نہیں؛ بلکہ یوروپی ممالک میں بھی اردو کے تہذیبی لسانی چراغ کو روشن رکھا ہے۔ پروفیسر حبیب الحق ندوی کے بہ قول: ''۱۹۶۴ء میں جنوبی افریقہ میں تبلیغی جماعت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کا پہلا اجتماع ۱۹۶۴ء میں شہر ڈربن میں منعقد ہوا۔۱۹۷۲ء تک لاکھوں کے مجمعے میں تمام تقاریر اردو زبان میں ہوتی رہیں''۔(دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ،ص:۴۸)

اسی طرح اس جماعت کا ایک عوامی نصاب تیار کرنے کے لیے مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے اپنے لائق وفائق برادرزادہ شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ کو حکم فرمایا، جس کی تعمیل میں ''فضائلِ اعمال'' وجود میں آئی ، جو اردو زبان میں ہے اور اسلوب وانداز کے لحاظ سے انتہائی آسان بھی۔اس کتاب میں عوام کو برے اعمال سے نفرت اور اچھے اعمال کی رغبت دلائی گئی ہے۔گرچہ دنیا کی اہم زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں؛ تاہم اس کے اردو وَرژن (نسخہ) کی نہ تو اہمیت میں کوئی فرق پڑا اور نہ ہی اس کی تعدادِ اشاعت میں کسی قسم کی کوئی کمی آئی۔اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اسے کوئی بھی اشاعتی ادارہ چھاپ سکتا ہے۔

''دورِ حاضر میں اردو زبان کی کثیر الاشاعت تصانیف'' کے زیرِ عنوان عارف اقبال صاحب نے لکھا ہے: ''اس (فضائلِ اعمال) کا عالمی شہرہ ہے، اس کا ترجمہ متعدد بین الاقوامی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ دورِ حاضر میں قرآن مجید کی اشاعت کے بعد غالباً یہ دوسری کثیر الاشاعت کتاب ہے''۔ (سہ ماہی 'اردو بک ریویو' دہلی، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۳ء ،مشترک شمارہ)

اردو کا تحفظ وبقا:

جس طرح دیوبند نے علمی، تعلیمی، تبلیغی، ملی اور سیاسی تحریک میں اردو زبان کو ترجیح دی اور نظری

وعملی ہر دو حوالوں سے اردو کو دیگر زبانوں پر مقدم رکھا اور اس کے تحفظ و بقا کے لیے تعمیری اور مثبت کوششیں کیں، اسی طرح ہندوستان کی آزادی کے بعد جب فرقہ پرست ذہنیت کی طرف سے اردو کے لیے ملک کی زمین تنگ کی جانے لگی تو ایسے برے وقت میں بھی دیوبند اور اس کے خوشہ چینوں نے نہ صرف یہ کہ اردو زبان کو اپنے گلے کا ہار بنائے رکھا اور اس کی صحت پہ کوئی خراش آنے نہیں دیا؛ بلکہ تحریکی طور پر بھی اس کے حقوق کی بازیابی کے لیے علمِ جہاد بلند کیا۔ دیوبند کے فاضل، ممتاز عالمِ دین اور معروف مصنف و سیاست داں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے پارلیامنٹ کے اندر بھی اور اس سے باہر بھی اردو زبان کو انصاف دلانے کے لیے پوری قوت سے آواز اٹھائی اور آخری دم تک اس کے لیے لڑتے رہے۔ ۱۹۵۱ء میں انجمن ترقی اردو کے تحت یوپی کے گورنر سے اردو کے حقوق کے مطالبے کا موقع ہو یا ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی دستخطی مہم ہو یا پھر ڈاکٹر تاراچند کی زیرِ صدارت ۱۹۵۸ء کی اردو کانفرنس ہو، پوری چاق چوبندی کے ساتھ مولانا سیوہاروی ہر جگہ کھڑے رہتے اور ہر حال میں حاضر رہتے۔ بہ قول ابرار احمد اجراوی کہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۱ء تک انجمن ترقی اردو کی دہلی شاخ کے ممبر رہے اور کسی میٹنگ سے کبھی غیر حاضر نہ رہے؛ یہاں تک کہ اس کی آخری میٹنگ (۲۵ نومبر ۱۹۶۱ء) میں شدید بخار و کھانسی کے باوجود کمبل اوڑھ کر حاضر ہوئے۔ (ادب امکان، ابرار احمد اجراوی، مہتاب پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء، ص: ۱۹۷)

ابرار اجراوی نے معروف ناقد اور انجمن ترقی اردو ہند کے اس وقت کے جنرل سیکریٹری آل احمد سُرور کے حوالے سے لکھا ہے: ''اردو تحریک میں مولانا لیڈر کی حیثیت سے نہیں، سپاہی کی حیثیت سے انجمن کا کام کرتے تھے، جہاں مولانا کی ضرورت محسوس ہوئی بھیج دیا، جہاں دقت ہوئی مولانا نے سلجھادی، جہاں اختلاف ہوا مولانا کی وجہ سے دور ہو گیا'' (روزنامہ ''الجمعیۃ'' مجاہد نمبر (۱۹۶۳ء) ص: ۱۳۲، بحوالہ ادب امکان، ص: ۱۹۹) اردو کے تحفظ و بقا اور ترویج و اشاعت کے لیے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے جذبۂ خلوص اور غیر معمولی جدوجہد کو نظر کرنا خلافِ انصاف ہے۔

تصنیف وتالیف:

اسی کے ساتھ فضلائے دیوبند نے اپنی گراں قدر تصنیفات سے بھی اردو زبان کے ذخیرے کو مالا مال کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ دیوبند کی تصنیفات کا بیشتر حصہ مذہبیات اور اسلامی علوم سے متعلق ہیں؛ تاہم تصانیف کا تیس فی صد حصہ ایسا بھی ہے کہ جو عوام سے ہم رشتہ ہے۔ پھر اس طرح کی کتابوں کا پچانوے فی صد حصہ بھی اردو زبان ہی میں ہے۔

دارالعلوم کی صد سالہ کارکردگی کے ضمن میں سید محبوب رضوی نے فضلائے دیوبند میں مصنّفین

کی مجموعی تعداد (۱۱۶۴) بتائی ہے؛ جب کہ اعلیٰ پایے کے مصنفین کی تعداد (۲۷۶) درج کی ہے۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج:۱،ص:۴۴۶۔۴۴۵)

قرآنیات، حدیث، فقہ، فلسفہ وتصوف، تاریخ وسیرت اورادب ولغت کے موضوع پر ایک سے بڑھ کر ایک کتابیں لکھی گئیں؛ لیکن گزشتہ پچاس برسوں میں بھی دیوبند کے فضلا نے سیکڑوں کی تعداد میں کتابیں تحریر کیں۔ ان میں بعض کتابیں اپنے موضوع کے اعتبار سے متنوع اور منفرد بھی ہیں اور بعضوں کو تو عالمی شہرت بھی حاصل ہوئی۔ مولانا صادق علی بستوی کی غیر منقوط منظوم سیرت ''داعیِ اسلام''، مولانا یاسر ندیم کی ''اسلام اور گلوبلائزیشن'' اور ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کی ''برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم اور دارالعلوم دیوبند'' وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

صحافت:

ہفت روزہ 'الہلال' (۱۹۱۲ء)، ہفت روزہ 'البلاغ' (۱۹۱۵ء) اور ہفتہ وار 'ہمدرد' (۱۹۱۳ء) وغیرہ ابھی پردۂ عدم میں ہی تھے کہ حضرت شیخ الہند نے اپنے دو شاگردوں: مولانا مقبول الرحمٰن سرحدی اور مولانا شوکت علی بنگالی کو آزادیِ ہند کی غرض سے چین کے محاذ پر روانہ کیا۔ ان دونوں حضرات نے شنگھائی کی سیرت کمیٹی کے تحت اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور یہیں سے ۱۹۰۵ء میں چینی اور اردو زبان کا ایک مشترک ماہنامہ ''السین'' جاری کیا جو ۱۹۰۹ء تک جاری رہا۔ (صحافت پابندِ سلاسل، ضمیر نیازی، اردو ترجمہ: اجمل کمال، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص: ۳۳۸) چین میں اسے اردو زبان کی پہلی اذان کہا جاسکتا ہے۔

دارالعلوم کی عمر جب اڑتالیس ہوگئی اور اس نے ۱۹۱۴ء میں اپنے آرگن ماہنامہ ''القاسم'' اور ۱۹۱۵ء میں ماہنامہ ''الرشید'' نکالنے کا فیصلہ کیا تو ان ماہناموں کو فارسی یا عربی زبان میں نہیں نکالا؛ بلکہ ان کی زبان شعوری طور پر اردو ہی تھی؛ جب کہ اس وقت دارالعلوم میں چوٹی کے عربی و فارسی کے اسکالر موجود تھے۔

دیوبند نے دیگر موضوعات کے ساتھ صحافت کو بھی اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا ہے اور اس راہ سے بھی اردو زبان کی زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں کے فضلا نے نہ صرف یہ کہ عملی طور پر اردو صحافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا؛ بلکہ انھوں نے اردو صحافت کو ایک نیا رنگ وآہنگ بھی عطا کیا۔ اس کے ذریعے یہاں کے فضلاء نے ملک کی آزادی میں غیر معمولی کردار ادا کیا اور ساتھ ہی ملک کی تعمیر وترقی میں بھی دیوبند کے ان صحافیوں کا غیر معمولی حصہ رہا ہے۔ مولوی سید ممتاز علی (م:۱۹۳۶ء) مولانا مظہر الدین شیرکوٹی (م:۱۹۳۸ء) شائق احمد عثمانی (م:۱۹۷۸ء) مولانا حامد الانصاری غازی

(۱۹۹۲ء) علامہ تاجور نجیب آبادی (م: ۱۹۵۱ء) مولانا سعید احمد اکبر آبادی (م: ۱۹۸۵ء) مولانا عبدالوحید صدیقی (۱۹۸۱ء) مولانا عامر عثمانی (م: ۱۹۷۵ء) اور مولانا محمد منظور نعمانی (م: ۱۹۹۷ء) وغیرہ کو بالترتیب 'تہذیبِ نسواں'، لاہور، سہ روزہ 'الامان' دہلی، روزنامہ 'عصرِ جدید' کلکتہ، سہ روزہ 'مدینہ' بجنور، ماہنامہ 'مخزن' 'ادبی دنیا' لاہور، ماہنامہ 'برہان' دہلی، ہفت روزہ 'نئی دنیا' دہلی، ماہنامہ 'تجلی' دیوبند اور ماہنامہ 'الفرقان' بریلی ولکھنؤ وغیرہ کے ذریعے کون نہیں جانتا۔ ان صحافیوں نے اپنے اپنے اخبارات ورسائل کے ذریعے اردو صحافت کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ آبِ زر سے لکھے جانے قابل ہے۔ اس کے علاوہ ہندو پاک اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے دیوبند کے فضلاء کی ادارت میں نکلنے والے اخبارات ورسائل کی تعداد بھی سیکڑوں میں ہے جو ایک مستقل موضوع کا متقاضی ہے اور اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے؛ بلکہ اب تو گزشتہ چند سالوں سے فضلائے دیوبند نے عملی صحافت کے ساتھ ساتھ نظری صحافت میں بھی اپنی دلچسپی کا مظاہرہ شروع کر دیا ہے۔ دیوبند کے فضلاء میں اس وقت اردو صحافت کے منظر نامے پر مولانا اسرار الحق قاسمی، مولانا عبدالحمید نعمانی، مولانا ندیم الواجدی، حقانی القاسمی، یوسف رام پوری، عبدالقادر شمس، عابد انور، وارث مظہری اور شہاب الدین ثاقب وغیرہ کے نام انتہائی نمایاں ہیں۔ اسی طرح سے گزشتہ تین چار برسوں میں نئے فضلاء کا رجحان اردو صحافت کی طرف بڑی تیزی سے بڑھا ہے۔ محمد نجیب قاسمی، غفران ساجد قاسمی، نایاب حسن قاسمی، شاہنواز بدر قاسمی، شمس تبریز قاسمی، نازش ہما قاسمی اور راحت علی صدیقی وغیرہ نوجوان نسل کی عمدہ مثال ہیں۔

اردو اور تحریکِ آزادیِ ملک:

دیوبند نے درس وتدریس اور تصنیف وتبلیغ کے ساتھ تحریک آزادی اور میدانِ کارزار میں بھی اردو کو بے یار ومددگار نہیں چھوڑا؛ چناں چہ جب شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اپنے جانباز شاگردوں اور ہم نواؤں کے ذریعے تحریک آزادئ ہند کی پہلی اور آخری عالمی تحریک ''ریشمی رومال'' کا آغاز کیا تو اس کا سارا خاکہ اردو زبان ہی میں تیار کیا گیا تھا۔ اس تحریک کے زیرِ اثر چین میں ماہنامہ ''السین''، جس کا ذکر پہلے گزر چکا، کے علاوہ ٹوکیو جاپان سے مولانا برکت اللہ بھوپالی نے The Islamic Fraternity (1910-1912) اور ان ہی کے ذریعے امریکہ سے ''غدر'' اور فرانس سے چودھری رحمت علی پنجابی نے ''الانقلاب'' جاری کیا جو متعلقہ خطے کی علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو زبان کے مشترک اخبار ورسائل تھے۔ گرچہ ان اخبارات کی روشنی زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہو پائی، اس کے باوجود یہ اخبار صحرا میں اذان دینے اور اندھیرے میں چراغ جلانے میں ضرور کامیاب رہے۔ اس سلسلے میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے ریشمی کپڑے پر جو تین خطوط تحریر فرمائے تھے اردو

زبان ہی میں تھے۔ان کے خطوط کا اصل مقصد مکہ میں قیام پذیر حضرت شیخ الہند کو خطۂ افغانستان کی سیاسی صورتِ حال سے آگاہ کرنا تھا۔مولانا عبیداللہ سندھی کی مادری زبان سندھی تھی، وہ فارسی کے علاوہ عربی زبان سے پوری طرح واقف تھے،ان زبانوں میں بھی وہ خط لکھ سکتے تھے اور شیخ الہند اسے سمجھ بھی سکتے تھے،اس کے باوجود مولانا سندھی نے عربی فارسی کی بجائے اردو ہی کو ترجیح دی۔اس عمل کو غیر شعوری کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا؛ بلکہ یہ عین شعوری اور منصوبہ بندی کے ساتھ اختیار کیا گیا ایک اہم قدم تھا۔

لغت نویسی:

لغت نویسی میں بھی دیوبند کا بڑا اہم حصہ ہے۔لغت نویسی کے لیے کس قدر صلاحیت اور علمی لیاقت درکار ہوتی ہے،اس سے اہلِ نظر اچھی طرح واقف ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ یہاں کی ایک لغت بھی ایسی نہیں ہے جو خالص اردو میں ہو؛ تاہم لطف کی بات یہ ہے کہ فضلائے دیوبند کی تصنیف کردہ ہر لغت کا تعلق اردو زبان سے ضرور ہے اور وہ لغات اردو دانوں ہی کے لیے لکھی بھی گئی ہیں۔خواہ وہ لغت قرآنی ہو یا حدیثی، فقہی ہو یا ادبی یا پھر طبی۔اس سلسلے میں مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی (م: ۱۹۷۱ء) کی 'مصباح اللغات'، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی 'قاموس القرآن' و 'بیان اللسان' حکیم عزیزالرحمٰن کی اردو۔انگلش 'میڈیکل ڈکشنری' (دوجلدیں) اور سہ لسانی 'انگریزی۔عربی۔اردو ڈکشنری'، مولانا وحیدالزماں کیرانوی کی 'القاموس الوحید' (دوجلدیں)، 'القاموس الجدید' اور 'القاموس الاصطلاحی' ایسے ہی معاصر لغات میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی 'قاموس الفقہ' (پانچ جلدیں) اور مولانا ندیم الواجدی کی 'القاموس الموضوعی' وغیرہ بہت مقبول و معروف ہیں۔غیر اردو دانوں کو اردو سے قریب لانے میں ان لغات کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔

تراجم:

دیوبند نے تراجم کے باب میں بھی وسعت بھر حصہ لیا ہے؛ لیکن اس کا بیشتر حصہ عربی و فارسی کے ان ترجموں پر مشتمل ہے جو محض درسی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ہاں کچھ ترجمے کو عمومیت ضرور حاصل ہے جن کا سرا عام اردو داں طبقے سے جا ملتا ہے۔جیسے قاضی سجاد حسین کا 'مثنوی مولانا روم' اور 'دیوانِ حافظ' کا ترجمہ،مولانا محمد اسلم قاسمی کا چھ ضخیم جلدوں میں 'سیرتِ حلبیہ' کا اردو ترجمہ اور مولانا ندیم الواجدی کا 'احیاء العلوم' کا طویل اردو ترجمہ اپنی نوعیت کا بے مثال کارنامہ ہے۔علاوہ ازیں قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا انظر شاہ کشمیری، حکیم عزیزالرحمٰن، مفتی کفیل الرحمٰن عثمانی، حقانی القاسمی اور مولانا نور عالم خلیل امینی وغیرہ کے نام اس باب میں انتہائی نمایاں ہیں۔

اردو یونیورسٹی:

دارالعلوم دیوبند اردو زبان کو عالمی حیثیت عطا کرنے میں بھی پیچھے نہیں رہا۔ اس کی شاندار مثال مولانا عبیداللہ سندھی کے ہاتھوں قائم کردہ کابل میں اردو کی پہلی یونیورسٹی ہے، وہاں کا ذریعۂ تعلیم بھی اردو تھا۔ افغانستان کے معروف محقق و دانشور پروفیسر عبدالخالق رشید نے 'افغانستان میں اردو کی پہلی یونیورسٹی' کے زیرِ عنوان اپنے ایک مضمون میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ (دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ، ص: ۴۹)

ایسے ہی دیوبند ہی کے ایک فاضل مولانا اطہر بنگالی ہیں جو آج سے ایک سو سال (۱۳۳۸ھ) قبل یہاں سے فارغ ہوئے تھے۔ وہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے معروف عالمِ دین اور مشہور ملی و سیاسی شخصیات میں تھے۔ انھوں نے بنگلہ دیش کے کشور گنج کے علاقے میں دارالعلوم کے طرز پر ایک عظیم مدرسہ قائم کیا تو اس میں بھی ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہی کو قرار دیا۔ (تاریخِ دارالعلوم دیوبند ج: ۲، ص: ۱۴۰) جب کہ اہلِ نظر اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ بنگلہ دیش بننے کے پس پردہ دیگر اسباب و عوامل میں سے ایک اردو بنگلہ کا تنازع بھی تھا۔ اس وقت بھی ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ دیش میں شعبۂ اردو کے ایک پروفیسر رشید احمد فاضلِ دیوبند ہیں اور ہندوستان کے اردو کے اہم پروگراموں میں ان کی شرکت ہوتی رہتی ہے۔

اسی طرح فضلائے دیوبند کے ذریعے ایران میں بھی اردو کا چراغ روشن ہے۔ وہاں کے بہت سے علماء اردو سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پروفیسر سعود عالم قاسمی اپنے ایک مضمون 'مدارس اور بیرونی ملکوں میں اردو زبان کی اشاعت' میں لکھتے ہیں: ''راقم نے ۲۰۱۱ء میں مشہد اور تہران کی زیارت کی، وہاں متعدد ایسے علماء سے ملاقات ہوئی جو اردو زبان سے واقف تھے۔ ان میں سے بعض ایسے تھے جنھوں نے اردو سے فارسی زبان میں متعدد علمی کتابوں کے ترجمے کیے تھے۔ مزید تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ حضرات دارالعلوم زاہدان کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اس مدرسے کو دارالعلوم دیوبند کے ایک قدیم فاضل مولانا عبدالعزیز قاسمی نے قائم کیا تھا۔ یہاں فارسی کے علاوہ اردو زبان پڑھائی جاتی ہے۔'' (اردو کے فروغ میں مدارس کا کردار، ص: ۳۹-۳۸)

دیوبند نے اردو زبان کو عالمی زبان بنانے میں جو لازوال کردار ادا کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۹۶۴ء میں ثقافت و سائنسی تحقیقات کے مرکزی وزیر پروفیسر ہمایوں کبیر جب دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے تو انھوں نے اپنی گفتگو میں دیوبند کی دیگر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی اردو خدمات کو بھی سراہا اور پوری قوت سے اپنے اس خیال کا برملا اظہار کیا: ''مجھے یہ معلوم ہوکر

خوشی ہوئی کہ آپ کے یہاں ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہے۔آپ کے یہاں جو طالبِ علم آتے ہیں ان کی زبان برمی ہو یا بنگالی، وہ فارسی بولتے ہوں یا انڈونیشی، انگریزی بولنے والے ہوں یا اور کوئی ان کی مادری زبان ہو، آپ انھیں اردو میں تعلیم دیتے ہیں، اس طرح پر آپ نے اردو کو بین الاقوامی زبان بنادیا ہے۔'' (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج:۱،ص:۳۶۴)

تاریخ دارالعلوم کے مصنف سید محبوب رضوی مرحوم نے مذکورہ حقائق کی توضیح کرتے ہوئے فضلائے دیوبند کے دوررس اثرات کا ذکر کیا ہے۔اس ضمن میں انھوں نے جنوبی اور مشرقی افریقہ میں مقیم فضلائے دیوبند کے زیر اثر وہاں کے اردو ماحول، اردو مراسلت اور اردو اخبارات کے حوالے دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس طرح دارالعلوم دیوبند نے اردو کے دائرے کو اپنے فضلا کے ذریعے سے دنیا کے تقریباً تمام ایشیائی وافریقی ممالک تک وسیع کر کے ہندوستان کی اس زبان کو بین الاقوامی زبان بنانے کا ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔'' (تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج:۱،ص:۳۶۶)

ان مختصر سطور سے بہ خوبی یہ علم ہوجاتا ہے کہ اردو کی توسیع وترویج میں دارالعلوم دیوبند کا بھی اہم حصہ ہے اور بغیر کسی وقفے کے یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اردو کی اس روشن خدمات سے انکار کوئی بھی منصف مزاج مورخ نہیں کرسکتا ہے؛ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حق ہے کہ آج تک اردو زبان کے ایسے مورخ کا زمانہ منتظر ہے۔

❁ ❁ ❁

مراجع:

۱- ادب امکان، ابرار احمد اجراوی، مہتاب پبلی کیشنز، نئی دہلی (۲۰۱۴ء)
۲- اردو کے فروغ میں مدارس کا کردار، مرتب: عبدالمعید قاسمی، فلاح المسلمین الہ داد پور سمیتی، فتح پور (۲۰۱۳ء)
۳- پسِ مرگ زندہ، نور عالم خلیل امینی، ادارۂ علم وادب دیوبند، (۲۰۱۰ء دوسرا اڈیشن)
۴- تاریخِ دارالعلوم دیوبند جلد اول، سید محبوب رضوی، ادارۂ اہتمام دارالعلوم دیوبند (۱۹۹۲ء)
۵- تاریخِ دارالعلوم دیوبند، جلد دوم، سید محبوب رضوی، ادارۂ اہتمام دارالعلوم دیوبند (۱۹۹۳ء)
۶- دارالعلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ، حقانی القاسمی، آل انڈیا تنظیم علمائے حق، نئی دہلی (۲۰۰۶ء)
۷- صحافت پابندِ سلاسل، ضمیر نیازی، اردو ترجمہ: اجمل کمال، ایجوکیشنل پریس، کراچی (۱۹۹۴ء)
۸- سہ ماہی 'اردو بک ریویو' دہلی، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۳ء، مشترک شمارہ
۹- ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی، مئی ۲۰۱۳ء، ج:۱۵،ش:۵

❁ ❁ ❁

اردو صحافت کی بدلتی قدریں-لمحۂ فکریہ

از: مولانا محمد مجیب الرحمٰن دیودرگی
استاذ دارالعلوم حیدرآباد

ملک بھر سے بڑی تعداد میں اردو اخبارات نکلتے ہیں، کتنے ہی روز نامے، کتنے ہی سہ روزہ اخبار، کتنے ہی ہفت روزہ؛ لیکن کتنے اخبارات ایسے ہیں جو عریانیت سے محفوظ ہیں؟ ایسے ہی اخبارات کا سرسری جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ چند ہی گنتی کہ اخبارات ہیں جو اس لعنت سے محفوظ ہیں، ورنہ اکثر اخبارات عریانیت کی لپیٹ میں آچکے ہیں، اور اپنے اخبارات پر عریاں تصاویر کی اشاعت میں انھیں کوئی جھجک نہیں، فحش مناظر کے پیش کرنے میں انھیں کوئی عار نہیں، فحش خبروں کی اشاعت میں انھیں کوئی مانع ورکاوٹ نہیں۔

صحافت درحقیقت حق کو ثابت کرنے باطل کو ختم کرنے کا مؤثر ہتھیار ہے، اس کے ذریعہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی بڑی حد تک ادا کیا جاسکتا ہے، اپنی بات عوام تک پہنچانے کا بہترین وسیلہ ہے۔ اپنے افکار وخیالات سے عوام کو آگاہ کرنے کا بہترین آلہ ہے، باطل کے خلاف منظّم محنت کا وسیع عملی میدان ہے، الکٹرانک میڈیا سے پھیلنے والے زہر کے خاتمہ کا بہترین ذریعہ ہے؛ لیکن ادھر کچھ دنوں سے اردو صحافت سوقیانہ پن کا شکار ہوتی جارہی ہے، حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کئی اخبارات تو وہ ہیں جو مذہبیت کے دعویدار ہیں اور قوم میں عقل وشعور پیدا کرنے اور دین سے قریب کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں؛ لیکن وہ بھی مال ودولت کی حرص میں اس زہر آلود عریانیت سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اہلِ اسلام کا ایک طبقہ وہ ہے جو ''ٹی وی'' کے زہر آلود اثرات سے دور ہے؛ جن کے خبریں جاننے کا ذریعہ عموماً اخبار ہی ہے، یہ افراد الکٹرانک میڈیا کے زہر اور عریانیت کے سیلاب سے محفوظ رہنے کی جدوجہد کررہے ہیں؛ لیکن افسوس جب وہ خبروں کو جاننے کے لیے احوال کے علم کے لیے اخبارات ہاتھ میں لیتے ہیں تو یہ اردو اخبار بھی نیم برہنہ اور عریاں تصاویر شائع کرکے ان کا دل

چھلنی کر جاتے ہیں اور انھیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ کیا ہم اب اردو اخبار بھی خرید نا بند کردیں؟ اخبارات کا مطالعہ عموماً سنجیدہ قسم کے افراد ہی کرتے ہیں جو اس طرح کی تصاویر ہرگز پسند نہیں کرتے ، گندہ معاشرہ تو گندہ ہی ہے ؛ لیکن یہ بے حیائی کے نظارے پاکباز افراد کو بھی گندگی پر آمادہ کرتے ہیں، عریاں تصاویر کی اشاعت صرف اشتہارات تک ہی محدود نہیں ؛ بلکہ بعض دفعہ ماڈل گرلس اور بعض دفعہ اداکاروں کی عریاں تصاویر بھی شاملِ اشاعت کی جاتی ہیں ، یہ درحقیقت ذمہ داروں کے ذوق کی عکاسی کرتی ہے، نہ تو ان تصاویر کی اشاعت سے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ان تصاویر کی پیشکش سے بازاروں میں اخبار کی اہمیت بڑھتی ہے؛ بلکہ بلاوجہ اس کے ذریعہ اپنے اخبار کو گندہ کیا گیا، نہ ہی عریاں تصاویر کی اشاعت توسیع اخبار کے لیے ضروری ہے اور نہ ہی عریاں اشتہارات کی اشاعت بقاءِ اخبار کے لیے ناگزیر، اس کے باوجود اس کا سہارا لیا جاتا ہے تو یہ سوچنا پڑے گا کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ جس طرح اشتہارات سے حاصل شدہ رقوم کے مالکینِ اخبار محتاج ہوتے ہیں ، ویسے ہی مشتہرین بھی ان اخبارات ہی کے محتاج ہوتے ہیں پھر بھی جو طرزِ عمل اپنایا جاتا ہے سمجھ سے بالاتر ہے، جب کوئی اخبار مکمل دینی روح سے آراستہ نہیں ہوسکتا تو اسے مکمل طور پر دینی جذبہ سے خالی بھی نہیں ہونا چاہیے، اگر کوئی روزنامہ ۱۰ر کی تعداد میں فروخت ہوتا ہے تو اوسطاً ہر اخبار کے پڑھنے والے پانچ شمار کیے جائیں تو اس بے حیائی کا شکار کتنے آدمی ہونگے ، اگر کوئی روزنامہ ۵۰/ ہزار کی تعداد میں فروخت ہوتا ہے، اس سے بے حیائی کا شکار کتنے افراد ہوں گے؟ جتنے افراد شکار ہوں گے ، جتنے افراد ان عریاں تصاویر کا مشاہدہ کریں گے ان کا وبال ذمہ داروں کے سر ہوگا ؛ کیونکہ انھوں نے گناہ کے لیے دعوتِ نظارہ دیا ہے۔

اپنے قارئین کی تعداد اپنے اخبار کی تعداد بڑے ذوق وشوق سے ظاہر کی جاتی ہے، فخریہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے، کبھی اپنے اخبار کی بے حیائی سے متأثرین کی فہرست بھی دی جائے، کبھی اس بے حیائی کے شکار افراد کو بھی شمار کروایا جائے، بعض اردو اخبارات کے ذمہ داروں کی حس تو اتنی مردہ ہوچکی ہے کہ وہ ماہِ رمضان میں بھی عریاں تصاویر اور فحش اشتہارات سے نہیں چوکتے نیز بے حیائی کے فروغ کے لیے جس راہ اور جس زبان اور جس طریقۂ کار کا انتخاب کیا گیا وہ انتہائی غلط ہے، اردو جیسی شریف اور مہذب زبان کو انہوں نے عریاں صحافت کے ذریعہ داغدار کرنے کی سازش رچی ہے، عریاں لٹریچر کی اشاعت کے لیے اور بھی زبانیں اور بھی طریقۂ کار تھے؛ لیکن جس مہذب زبان

کا انھوں نے سہارا لیا یہ خود جرمِ عظیم ہے، ایک طرف اردو کے فروغ کے دعوے دار ہیں، دوسری جانب اردو کیساتھ یہ گھناؤنا مذاق؟ بالکل یہی حال؛ بلکہ اس سے بڑھ کر جرمِ عظیم عربی زبان کیساتھ ہورہا ہے، فواحش کی اشاعت کے لیے عربی زبان کا سہارا لیا جارہا ہے، جو قرآن کریم کی زبان ہے جو اہلِ جنت کی زبان ہے جو وسیع ترین عالمی زبان ہے، ایک طرف مدیرانِ اخبار اداراتی صفحات میں مذہبی مضامین کو ضرور جگہ دیتے ہیں جو مغربی تہذیب کے خلاف ہو اور دیگر مواقع پر فلمی تہذیبی جھلک کہہ کر مغربیت پیش کرتے ہیں تو اس طرح کی دوغلی پالیسی سے کیا فائدہ؟

ایک جانب اخبارات اخلاقی اقدار کی پامالی کے مرتکب ہیں تو دوسری جانب بہت سے رسائل بھی اپنے رسائل سے اخلاقیات کا جنازہ نکال رہے ہیں، کئی رسائل جو مذہبیت کے حامی ہیں، قوم کی تعمیر کے دعویدار ہیں، ملت کی اخلاقی زبوں حالی پر ماتم کناں ہیں؛ لیکن کیا قوم کی تعمیر فحش مناظر اور فحاشی وعریانیت سے لبریز خبروں سے کرنا جائز ہے؟ کئی رسائل اب بھی فلمی تہذیب وتمدن کی جھلکیں پیش کرتے ہوئے کوئی عار محسوس نہیں کرتے، الغرض! اردو جیسی مہذب زبان کا استعمال فحش خبر وکی ترسیل اور فحاشی وعریانیت کے لیے کسی بھی درجہ میں درست نہیں، اولاً تو فحاشی کا فروغ ہی قابلِ مواخذہ ہے تو اس فحاشی سے اردو کو داغدار کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟

اللہ تعالی سورۂ نور میں فرماتے ہیں: بلا شبہ اہلِ ایمان میں سے جو لوگ فحش چیزوں کی اشاعت کو پسند کرتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے (النور:۱۹) آیتِ کریمہ میں فحش خبروں کی اشاعت کو موردِ طعن ومورِدِ ملامت قرار دیا گیا، فحش خبروں اور فحش گفتگوں سے برائی کچھ پھیلتی ہے، برائی کا شیوع ہوتا ہے، فحش تصاویر کی اشاعت تو عوام کو برائی پر آمادہ کرتی ہے، ہیجان انگیز عریاں تصاویر گناہوں پر برانگیختہ کرتی ہیں، فحش تصاویر کی اشاعت کا جرم خبروں کی اشاعت سے بڑھا ہوا ہے۔ مذکورہ آیتِ کریمہ کی تفسیر میں وھبہ زحیلی فرماتے ہیں:

''یہ بہترین نظام ہے جس سے کئی فوائد ہیں عوام میں فحش چیزوں کی اشاعت عوام کو گناہ پر آمادہ کرتی ہے اور گناہ میں پڑنا آسان ہوجاتا ہے۔ اور آیتِ کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ محض فحش چیزوں کی اشاعت کی محبت عذاب کے لاحق ہونے کے لیے کافی ہے، اور جو عملی طور پر اس میں شریک ہوں ان کا جرم تو بہت بڑھا ہوا ہے اور عقاب بھی ہے۔'' (تفسیر منیر ۱۸۲/۱۸)

اسی طرح مولانا عبدالماجد دریا آبادی رقمطراز ہیں:

'' قرآن کریم نے اس آیت کے ذریعہ امت کو ایک مستقل دستور العمل قیامت تک کے

لیے پاکیزہ معاشرہ دیا ہے، اسلامی معاشرے میں گندے شہوانی تذکروں اور چرچوں کی جڑ ہی کاٹ دی؛ لیکن مقدم آیت کے عموم میں وہ تمام افعال وحرکات داخل ہیں جو امت کے معاشرے میں براہِ راست یا بالواسطہ کسی طرح بھی بے حیائی، شہوانیت، بدچلنی کے زندہ رہنے کا سبب بنتے ہیں، خواہ ان کا نام آرٹ کی سرپرستی یا کلچر کی ترقی ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔'' (تفسیر ماجدی ۳/۴۴۶)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: میں ایک ایسی قوم کو جانتا ہوں جو سینوں کو پیٹ رہے ہوں گے، جس کے مارنے کی آواز اہلِ جہنم بھی سنیں گے، ان میں ایک طعنہ زن ہے اور وہ افراد ہیں جو لوگوں کے عیوب تلاش کرتے ہیں اور پردہ دری کرتے ہیں اور ان فحش چیزوں کی اشاعت کرتے ہیں جو ان میں نہیں۔ (تفسیر کبیر ۱۱/۲۷۹ شاملہ)

الغرض اردو اخبارات کے مدیران اور اس کے ذمہ داران سے ہمارا پرزور مطالبہ ہے کہ وہ اپنے اخبارات سے عریانیت وفحاشیت کا مکمل خاتمہ کریں اور ایسی خبریں جس سے فواحش کا فروغ ہو، ان کی اشاعت سے باز رہیں، اسی طرح ایسے مناظر جن سے فواحش کو بڑھاوا ملے انھیں شائع کرنے سے مکمل اجتناب کریں اور عریاں اشتہارات سے گریز کریں، مدیران سے ہماری پرخلوص گزارش ہے کہ وہ اپنے اخبار میں دینی روح باقی رکھنے کی سعی جدوجہد کریں، اپنے اخبارات کا مطمحِ نظر صرف کمائی یا ریاکاری ونام نمود نہ رکھیں؛ بلکہ اس سے درحقیقت امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنے اخبارات کے ذریعہ زرد صحافت کا تعاقب کریں، اپنے اخبار کے ذریعہ دعوتِ دین کا اہم اور بنیادی فریضہ انجام دیں، قارئین اخبار کی ذمہ داری ہے کہ وہ مراسلتی خطوط کے ذریعہ فواحش کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کریں، ان فواحش پر بند لگانے کا مطالبہ کریں، ان فواحش سے ہونے والے نقصانات سے آگاہ کریں اور انھیں یہ اطلاع دیں کہ اردو صحافت عریانیت کے تعاقب کے لیے ہے، نہ کہ عریانیت کے فروغ کے لیے، اگر انھیں عریانیت کے فروغ کے لیے استعمال کیا گیا تو زرد صحافت کا تعاقب کون کرے گا؟ ان اخبارات کے ذریعہ مکمل اسلامی روح پیش کرنے کا اہتمام کریں، اربابِ حل وعقد کی ذمہ داری ہے کہ ان ذمہ دارانِ اخبارات سے مؤثر نمائندگی کرتے ہوئے عریانیت کا خاتمہ کرنے کا مطالبہ کریں، انھیں آگاہ کریں کہ تصاویر سے نسلِ نو پر برے اثرات مرتب ہورہے ہیں۔

❁ ❁ ❁

خواتین کا ذوقِ عبادت

از: مولانا محمد غیاث الدین حسامی

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالی نے انسان کے مقصد زندگی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے انسانوں اور جنات کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، (الذاریات ۵۶) یہی بات ایک حدیث قدسی میں کچھ تفصیل کے ساتھ ہے کہ اے میرے بندو! میں نے تمہیں اس لیے پیدا نہیں کیا کہ تم تنہائی میں میرے انیس بنو، اور نہ اس لیے کہ قلت میں تمہارے ذریعے میں کثرت حاصل کرو، اور نہ اس لیے کہ تنہا ہونے کے باعث کسی کام کے کرنے سے عاجز ہو کر میں تمہاری مدد کا طلب گار بنوں اور نہ اس لیے کہ تمہارے ذریعہ کوئی نفع حاصل کروں یا کسی مضرت کو دفع کروں، میں نے تو تمہیں اس لیے پیدا کیا کہ تم زندگی بھر میری بندگی اختیار کروں، کثرت سے میرا ذکر کرو اور صبح و شام میری تسبیح پڑھتے رہو۔ (عبادت کا حقیقی مفہوم مصنف ڈاکٹر یوسف القرضاوی ۴۳)

عبادت کے تعلق سے اللہ تعالی نے بنی نوعِ انسان کے ہر فرد بشر سے ایک مضبوط عہد لیا ہے، جسے قرآن مجید نے واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ اے آدمؑ کی اولاد! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا ہے کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا؛ اس لیے کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اور میری ہی عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے (سورہ یٰسین ۶۰-۱۶)؛ لیکن انسان گردشِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس وعدۂ خداوندی کو بھول گیا، اور ایک خدا کی عبادت کی بجائے کئی خداوں کی عبادت کرنے لگا، اور ہر ذی اثر چیزوں کو خدا کا درجہ دے دیا، اس کی اسی غفلت کی وجہ سے اللہ تعالی نے نبیوں اور رسولوں اور نزولِ کتب کا سلسلہ شروع کیا، جس کے ذریعہ پوری انسانیت کو ایک اللہ سے کیے ہوئے اس وعدے کو یاد دلایا اور انھیں بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت کی طرف پھیر دیا، ان نیک

فطرت نبیوں اور رسولوں کا اپنی قوم کے لیے ایک ہی نعرہ تھا کہ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارے لیے کوئی معبود نہیں ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیتوں اور رسول اللہ ﷺ کی بہت سی احادیث میں عبادت کی بہت تاکید کی گئی ہے، اور یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ جو شخص اپنے مقصدِ زندگی (عبادت) میں کامیاب ہوگا وہی ربّ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرے گا اور جو ناکام و نامراد ہوگا وہ ربّ کی ناراضگی کی وجہ سے عذاب وعقاب کا مستحق ہوگا؛ اس لیے بندے کی اصل کامیابی حکمِ الٰہی اور طریقۂ نبوی ﷺ کے مطابق عبادت کرنے میں مضمر ہے، اور جو بندہ عبادت و بندگی کے علاوہ دوسرے طریقہ میں کامیابی کا طلب گار ہوگا، اُس کے لیے ناکامی لکھ دی گئی ہے۔

اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں مردوں کے اوصافِ بندگی کے ساتھ ساتھ عورتوں کے اوصافِ عبادت کو بھی ذکر کیا، اور اس پر ملنے والے اجر وثواب کا انھیں بھی مستحق قرار دیا، جس کی طرف قرآن کریم کی یہ آیت اشارہ کررہی ہے، یقیناً مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، اللہ سے ڈرنے والے مرد اور اللہ سے ڈرنے والی عورتیں، صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنے ستر کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنے ستر کی حفاظت کرنے والی عورتیں، اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور اللہ کا ذکر کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کیا ہے (الاحزاب ۵۳)

تاریخِ اسلام اس بات پر گواہ ہے کہ ابتدائے اسلام سے آج تک عبادت و بندگی کے اس حکم پر جہاں مردوں نے عمل کیا ہے وہیں عورتیں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں، خالق کائنات کی رضا جوئی کے لیے جہاں مرد اپنی راتوں کو عبادت سے مزین کیے وہیں عورتیں بھی اطاعت و بندگی کے ذریعہ اپنی راتوں کو سجائیں، اور اپنے مولی سے ہم کلامی کے لیے شب بیداری اور آہِ سحر گاہی کا معمول بنائیں، جہاں رسول اللہ ﷺ پورے جذبہ کے ساتھ عبادت میں مصروف ہوا کرتے وہیں آپ ﷺ کی صحبت میں رہنے والی ازواجِ مطہرات بھی پورے شوق وجذبہ کے ساتھ فریضۂ بندگی بجالاتیں، جہاں صحابہ طریقۂ نبی ﷺ کے مطابق عبادت کیا کرتے وہیں، صحابیات بھی آپ ﷺ کی تعلیمات کی مطابق عمل کرتیں، اور جس طرح عبادت کے میدان میں حسن بصریؒ

جیسے باکمال ولی پیدا ہوئے اسی طرح رابعہ بصریہؒ جیسی ولیہ بھی پیدا ہوئیں، عبادت گذاروں کی فہرست اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی؛ جب تک ان برگزیدہ خواتین کا تذکرہ نہ کیا جائے، جن کے جذبۂ عبادت و بندگی اور رضائے الٰہی کے حصول کی کوششوں کو دیکھ کر موجودہ دور کی خواتین بھی اپنے مقصدِ زندگی کو یاد کرسکتی ہے اور اپنے مولی حقیقی کی عبادت میں ہمہ تن مصروف ہوسکتی ہے۔

خیر القرون اور دورِ سلفِ صالحین کی خواتین کو عبادت کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ اپنے دن ورات کا اکثر حصہ عبادتِ الٰہی میں گذارتیں اور اپنے آپ کو ان اعمال میں لگاتیں جو خدا اور اس کے رسول ﷺ کو راضی کرنے والے ہوتے، عبادت کے ذریعہ اس مقام ومرتبہ پر پہونچ گئی تھیں جس تک آج کے بڑے بڑے ولی صفت انسان کا بھی پہنچنا مشکل ہے۔

آپ ﷺ کی سب سے چہیتی بیوی حضرت عائشہ صدیقہؓ عبادت گذار تھیں، اللہ سے نہایت ڈرنے والی تھیں، چاشت کی نماز پابندی کے ساتھ ادا کرتی تھیں، رمضان المبارک میں تراویح کا خاص اہتمام کرتیں، ان کا غلام نمازِ تراویح میں امامت کرتا اور وہ مقتدی ہوتیں، اکثر روزے رکھا کرتیں، پورے جذبہ کے ساتھ ہر سال برابر حج ادا کرتیں، غلاموں پر شفقت کرتیں اور ان کو خرید کر آزاد کرتیں (شرح بلوغ المرام)

امّ المومنین حضرت امّ سلمہؓ کی زندگی نہایت زاہدانہ تھی، انھیں عبادت الٰہی سے بہت زیادہ لگاؤ تھا، رمضان شریف کے علاوہ ہر مہینہ میں تین روزے پابندی کے ساتھ رکھا کرتیں، اطاعتِ خداوندی ہر عمل میں صاف نظر آتا تھا، جہاں اوامر کی بے حد پابند تھیں وہیں نواہی سے بھی بچنے کا التزام کرتی تھیں۔ (ابن سعد)

امّ المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ بڑی دیندار، پرہیز گار، حق گو اور رونے والی تھیں، ان کی عبادت و زہد کا اعتراف خود رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اپنی کتاب ''الاصابۃ'' میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ مہاجرین کی ایک جماعت میں مالِ غنیمت تقسیم فرمارہے تھے، حضرت زینبؓ بھی اس موقع پر موجود تھیں، انھوں نے کوئی ایسی بات کہی جو حضرت عمرؓ کو پسند نہیں آئی، انھوں نے ذرا تلخ انداز میں حضرت زینبؓ کو دخل دینے سے منع کیا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا، اے عمرؓ انھیں کچھ نہ کہو یہ اوّاہ (خدا سے ڈرنے والی) ہیں۔

امّ المومنین حضرت جویریہؓ بھی بڑی عبادت گذار اور زاہدانہ زندگی گذارنے والی خاتون

تھیں، رسول اللہ ﷺ انھیں اکثر عبادت و بندگی میں مشغول پاتے، آپ ﷺ جب کبھی گھر سے باہر جاتے یا گھر تشریف لاتے تو انھیں اپنے ربّ سے راز و نیاز کرتے ہوئے پاتے، ایک دن حضورانور ﷺ نے انھیں صبح کے وقت اپنے گھر کی مسجد (نماز کی جگہ) میں عبادت کرتے ہوئے دیکھا پھر ضروریات سے فارغ ہوکر آئے تو بھی اسی حالت میں ان کو پایا، آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم ہمیشہ اسی طرح عبادت کرتی رہتی ہو، انھوں نے کہا: جی ہاں یارسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کلمات پڑھا کروان کوتمہاری نفل عبادت پر ترجیح حاصل ہے: سبحان اللّٰہ، سبحان اللّٰہ عدد خلقه سبحان اللّٰہ عدد خلقه سبحان اللّٰہ رضی نفسه سبحان اللّٰہ رضی نفسه، سبحان اللّٰہ زنة عرشه سبحان اللّٰہ زنة عرشه، سبحان اللّٰہ مداد کلماته، سبحان اللّٰہ مداد کلماته (مسند احمد، حدیث جویریہ بنت الحارث، حدیث نمبر ۳۳۰۸/ ناشر موسسۃ الرسالۃ)

مسند احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جوشخص بارہ رکعات نفل روزانہ پڑھے گا اس کے لیے جنت میں گھر بنایا جائے گا، آپ ﷺ کا یہ ارشاد حضرت امّ حبیبہؓ بھی سن رہی تھیں، اس کے بعد پوری زندگی یہ بارہ رکعات ان کے معمول میں رہیں کبھی ان کو ترک نہیں کیا (مسند احمد حدیث ابی موسی الاشعری حدیث نمبر ۱۹۷۰۹/ ناشر موسسۃ الرسالۃ)

حضرت سیدہ فاطمہ الزہراؓ کو عبادتِ الٰہی سے بے انتہا شغف تھا، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ تہجد گذار اور کثرت سے روزے رکھنے والی تھیں، خوفِ الٰہی سے ہر وقت لرزاں اور ترساں رہتی تھیں، زبان پر ہمیشہ اللہ تعالی کا ذکر جاری رہتا تھا، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں فاطمہؓ کو دیکھتا تھا کہ کھانا پکاتی تھیں، اور ساتھ ساتھ خدا کا ذکر کرتی جاتی تھیں، حضرت سلمان فارسیؓ کا بیان ہے کہ حضرت فاطمہؓ گھر کے کام کاج میں لگی رہتی تھیں اور قرآن مجید کی تلاوت کرتی رہتی تھیں، وہ چکّی پیستے وقت بھی قرآن پاک کی تلاوت کرتی تھیں، علاّمہ اقبال نے اپنے اس شعر میں ان کی اسی عادت کی طرف اشارہ کیا ہے، شعر

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآں سرا

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ فاطمہؓ اللہ تعالی کی بے انتہا عبادت کرتی تھیں؛ لیکن گھر کے کام

میں کوئی فرق نہیں آنے دیتی تھیں، سیدنا حسنؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنی والدہ ماجدہ کو صبح سے شام تک محرابِ عبادت میں اللہ تعالی کے آگے گریہ وزاری کرتے، نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ اس کی حمد وثنا کرتے اور دعائیں مانگتے دیکھا کرتا تھا، اور یہ دعائیں وہ اپنے لیے نہیں؛ بلکہ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے مانگتی تھیں، عبادت کرتے وقت آپ کا نورانی چہرہ زرد ہوجاتا تھا، جسم پر لرزہ طاری ہوجاتا تھا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی یہاں تک کہ اکثر مصلّی آنسوؤں سے بھیگ جاتا تھا، حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی عبادت کا یہ حال تھا کہ اکثر ساری رات نماز میں گذار دیتی تھیں بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی عبادتِ الٰہی کو ترک نہیں کرتی تھیں، اللہ تعالی کی عبادت، اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی رضاجوئی اور سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی ان کے رگ وریشے میں سما گئی تھیں (سیرت فاطمۃ الزہراؓ)

حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ عبادت وبندگی میں شہرہ رکھتی تھیں، نہایت درجہ کی عابدہ اور زاہدہ تھیں، کثرت عبادت ان کا خصوصی وصف تھا، ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کسوف کی نماز پڑھا رہے تھے، بہت سے صحابیات بھی شریکِ نماز تھیں، ان میں حضرت اسماءؓ بھی شامل تھیں، آپ ﷺ نے نماز کو کئی گھنٹے طویل کیا، حضرت اسماءؓ کی طبیعت کچھ کمزور تھی، تھک کر چور چور ہوگئیں؛ لیکن بڑے استقلال سے کھڑی رہیں، جب نماز ختم ہوئی تو غش کھا کر گر پڑیں، چہرے اور سر پر پانی چھڑکا گیا تو ہوش میں آئیں (بخاری شریف، باب صلاۃ النساء مع الرجال فی الکسوف، حدیث نمبر ۱۰۵۳)

آپ ﷺ کی چچی حضرت امّ الفضلؓ نہایت پرہیزگار اور عبادت گزار تھیں، بعض روایتوں میں ہے کہ وہ ہر پیر اور جمعرات کو ہمیشہ روزہ رکھا کرتی تھیں۔

حضرت خولاءؓ بھی عبادت الٰہی سے کافی شغف رکھتی تھیں اور ساری عبادت اور نماز پڑھنے میں گذارتی تھیں ان کا تذکرہ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں حضرت خولاءؓ کا ادھر سے گذر ہوا تو حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ خولاء ہے، جو پوری رات عبادت میں گذارتی ہے اور رات بھر سوتی نہیں، اس پر آپ ﷺ نے تعجب سے فرمایا کہ رات بھر نہیں سوتیں؟ پھر فرمایا کہ انسان کو اتنا ہی کام کرنا چاہیے جسے وہ ہمیشہ نباہ سکے (مسند احمد، مسند عائشہ حدیث نمبر ۲۵۶۳۲/ ناشر موسسۃ الرسالۃ)

حضرت صفوان بن معطلؓ کی اہلیہ ایک مرتبہ آپ ﷺ کے پاس آکر شکایت کرنے لگی کہ ان کے شوہر انھیں نماز پڑھنے کی بنا پر سختی کرتے ہیں، جب میں روزہ رکھتی ہوں تو میرا روزہ بھی تڑوادیتے ہیں، حضور انور ﷺ نے صفوان بن معطلؓ سے وجہ دریافت کی تو انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ یہ نماز میں دو لمبی لمبی سورتیں پڑھتی ہیں اور میں انھیں اس سے منع کرتا ہوں، اور روزہ تڑوانے کی حقیقت یہ ہے کہ جب یہ نفلی روزے رکھنے پر آتی ہیں تو رکھتی ہی چلی جاتی ہیں جو میرے لیے تکلیف دہ ہے۔ (مسند احمد، مسند ابی سعید خدریؓ، حدیث نمبر ۱۱۰۸۰)

حضرت عائشہ بنت طلحہؒ مشہور تابعیہ ہیں، بڑی ذاکرہ تھیں، ان کی زبان صبح وشام ذکر الٰہی سے تر رہا کرتی تھی، ان کا نفس پاکیزہ ہوچکا تھا جس نے انھیں تمام عورتوں میں ممتاز کردیا تھا، انھیں بہت ساری باتیں خواب کے ذریعہ معلوم ہوجاتی تھیں۔

خوابوں کی تعبیر بتانے والے مشہور امام محمد ابن سیرینؒ کی بیٹی حفصہ بنت سیرینؒ اپنے زمانے کی معروف تابعیہ ہیں، جن کے بلند مرتبہ کی گواہی اہلِ معرفت حضرات نے دی ہے، حفصہ بنت سیرینؒ پاکیزگی، عزت وعفت، اور دین وعبادت کے اعتبار سے عورتوں کی سردار تھیں، ان کی الگ کوٹھری تھی جس میں وہ اکثر عبادت کرتی تھیں؛ اسی لیے عبادت کے معاملے میں بہت ممتاز مقام رکھتی تھیں، اور وہ اس صفت میں حیرت انگیز مقام پر پہنچ گئی تھیں، جہاں پر صرف بڑے زاہدین کی ہی رسائی ہوتی ہے، مہدی بن میمونؒ فرماتے ہیں کہ حفصہ بنت سیرینؒ تیس سال تک اپنے مصلّی سے سوائے کسی کی بات کا جواب دینے یا قضاء حاجت کے نہیں نکلیں (سیر اعلام النبلاء، باب عمرۃ بنت عبدالرحمٰن ۴/ ۵۰۷)

حضرت معاذۃ بنت عبداللہؒ تابعیہ ہیں اور حضرت عائشہؓ وحضرت علیؓ کی شاگردہ ہیں، اپنے وقت کی بڑی عابدہ خاتون تھیں، اپنے نفس کو مخاطب کرتیں اور کہتیں کہ اے نفس! نیند تیرے سامنے ہے، اگر تو چاہے تو تیری قبر میں نیند حسرت یا خوشی میں لمبی ہوسکتی ہے، جب انھیں نیند نہیں آرہی ہوتی تو فوراً اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی مناجات میں مستغرق ہوتیں (سیر اعلام النبلاء، باب معاذۃ بنت عبداللہ ۴/۵۰۹) حضرت معاذہؒ کو صبح کی تلاوت بہت محبوب تھی، ان کا دل اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا میں مصروف رہتا تھا، عبادت وبندگی کو اپنی عادت بنالی تھی، یہاں تک کہ شبِ زفاف بھی عبادت میں گذر گئی، پوری رات عبادت اور ذکر واذکار کرتی رہی؛ یہاں تک کہ فجر کی اذان ہونے

لگی، ان کا معمول تھا کہ روزانہ چھ سو رکعات نماز پڑھتیں اور ہر رات وہ قرآن کریم کی تلاوت بھی کرتیں، جب سردی کا موسم ہوتا تو حضرت معاذہؒ پتلے کپڑے پہنتیں؛ تاکہ سردی کی وجہ سے نیند نہ آئے اور عبادت میں سستی پیدا نہ ہو۔ (نساء من عصر التابعین مصنف احمد خلیل جمعہ)

حضرت عبداللہ بن مسلم عجلیؒ بیان کرتے ہیں کہ مکہ میں ایک نہایت حسین وجمیل خاتون رہتی تھی اور اسے اپنے حسن وجمال پر بڑا ناز تھا، ایک مرتبہ وہ عبید بن عمیرؒ کے پاس ایک مسئلہ پوچھنے لگی اور دورانِ گفتگو اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا کر انھیں اپنی طرف مائل کرنے لگی تو عبید بن عمیرؒ نے اس عورت کو (موت، قبر، اللہ کے سامنے حاضری کے ذریعہ) نصیحت فرمائی اور اسے اعمال خیر پر اُبھارا، اتنی سے گفتگو پر وہ اس قدر متاثر ہوئی کہ گھر جا کر شوہر سے کہنے لگی کہ ہم دونوں نے آج تک آوارگی اور غفلت میں زندگی گذاری ہے، اس کے بعد سے وہ نماز، روزہ اور عبادت میں مصروف ہوگئی، اس عورت کا شوہر کہا کرتا تھا کہ عبید بن عمیرؒ نے میری بیوی کو کیا کردیا ہے جو ہر وقت عبادت الٰہی میں مشغول رہتی ہے اور رہبانیت کی زندگی گذارتی ہے۔ (تنبیہ الغافلین)

یہ واقعات بتاتے ہیں کہ عورت ذات عبادت کے معاملہ میں کبھی مردوں سے پیچھے نہیں رہی؛ بلکہ ان کا ذوق عبادت اور اللہ تعالی سے خصوصی تعلق ومحبت مثالی رہا ہے، آج کل کی خواتین بھی ان کے نقش قدم پر چل کر دنیا وآخرت میں سرخ رو ہوسکتی ہیں، اللہ تعالی ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے! آمین۔

❁ ❁ ❁

مسائل وفتاویٰ

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند، ملتِ اسلامیہ کا سب سے معتمد دارالافتاء ہے، جس سے ہر ماہ سیکڑوں فتاویٰ صادر ہوتے ہیں۔ ماہ نامہ دارالعلوم کے قارئین کی دیرینہ خواہش تھی کہ دارالافتاء کے فتاویٰ سے استفادہ کا موقع دیا جائے؛ اس لیے اس شمارے سے منتخب فتاویٰ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔

سوال:

(۱) جوائنٹ فیملی کے اندر شرعی پردے کا کیا حکم ہے؟

(۲) شرعی پردے کے بارے میں جوائنٹ فیملی میں کیا حقوق ہیں؟

(۳) کن کن امور پر کہاں تک پردہ کرنے کی گنجائش ہے، تفصیل سے بتائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق (۱-۳): عورت کا اجنبی مردوں سے پردہ کرنا لازم وضروری ہے اگرچہ وہ اجنبی مرد، عورت یا اس کے شوہر کے قریبی رشتہ دار ہوں، جیسے: شوہر کا بھائی اور چچا زاد بھائی وغیرہ؛ بلکہ حدیثِ پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہر کے بھائی کو عورت کے حق میں موت قرار دیا ہے (مشکوۃ شریف ص ۲۶۸، بحوالہ: صحیحین، مطبوعہ: مکتبہ اشرفیہ دیوبند)، یعنی: اس سے سخت پردہ کی ضرورت ہے؛ اس لیے عورت کو شوہر کے یا اپنے قریبی رشتہ داروں میں جو اجنبی مرد ہوں، ان سے پردہ کا خاص اہتمام کرنا چاہیے؛ تاکہ فتنوں کا انسداد رہے؛ البتہ اگر مالی تنگی کی وجہ سے پردہ شرعی کے لیے الگ الگ مکانات کا نظم سخت مشکل ودشوار ہو اور بچے بچیاں بڑی ہوچکی ہوں اور گھر میں بہوئیں آچکی ہوں تو ایسی صورت میں بوجہ مجبوری درج ذیل چند باتوں کی رعایت کے ساتھ مشترکہ فیملی میں رہنے کی گنجائش ہوسکتی ہے:

۱- اجنبی مرد اور عورتیں یا لڑکے لڑکیاں بے تکلف ایک دوسرے کے سامنے نہ آئیں۔ ۲:- یہ لوگ بلاضرورت ایک دوسرے سے کوئی گفتگو نہ کریں۔ ۳- نامحرم کے ساتھ خلوت وتنہائی سے

سخت پرہیز کیا جائے۔۴- مرد اور لڑکے اطلاع کے بغیر گھر کے اندر نہ آئیں۔۵- عورت اگر کمرے سے باہر صحن وغیرہ میں آنا چاہے تو موٹی چادر یا دوپٹہ سے بال وغیرہ ڈھانک کر نکلے، چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی رہیں تو گنجائش ہے (فتاوی دارالعلوم دیوبند ۱۶: ۱۹۹-۲۰۱، سوال: ۳۷۹-۴۳۸۱، مطبوعہ: مکتبہ زکریا دیوبند، احسن الفتاوی ۹: ۳۷، مطبوعہ: ایچ، ایم، سعید کمپنی، کراچی، آپ کے مسائل اور ان کا حل جدید تخریج شدہ ۸: ۸۹، ۹۰، مطبوعہ: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند بحوالہ: تعلیم الطالب، مؤلفہ: حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ص ۵)۔ **فقط واللہ تعالیٰ اعلم.**

محمد نعمان سیتاپوری غفرلہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ

مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ مطابق ۲/ مارچ ۲۰۱۶ء چہارشنبہ

❁ ❁ ❁

بعد سلام دعا عرض ہے کہ کیا بیت الخلاء میں ہم وضو شروع کرنے اور ختم کرنے کی مسنون دعائیں پڑھ سکتے ہیں اور وہاں آئینہ بھی لگا ہے تو کیا ہم آئینہ دیکھنے وقت کی مسنون دعا پڑھ سکتے ہیں؛ جب کہ بیت الخلاء ایک نجاست والی جگہ ہے . جزاک اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: -اگر بیت الخلاء میں غسل خانہ بھی ہے، یعنی: اٹیچ لیٹرین باتھ روم ہے اور دونوں ایک دوسرے سے واضح طور پر ممتاز ہیں، مثلاً دونوں کے درمیان کوئی چھوٹی دیوار ہے اور غسل خانہ کے حصہ میں بیت الخلاء کی بدبو وغیرہ محسوس نہیں ہوتی تو غسل خانہ والے حصے میں وضو کرتے وقت وضو کی دعائیں پڑھ سکتے ہیں؛ البتہ ہلکی آواز سے پڑھے، زور سے نہ پڑھے۔ اسی طرح اگر آئینہ غسل خانے کے حصہ میں ہے تو آئینہ دیکھتے وقت آئینہ کی دعا بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اور اگر بیت الخلاء اور غسل خانہ دونوں واضح طور پر ممتاز نہیں ہیں یا وہ دراصل صرف بیت الخلاء ہے اور ہاتھ منھ دھونے کے لیے کسی جگہ کنارے کوئی چھوٹا سا واش بیسن لگا دیا گیا ہے، جیسے عام طور پر ٹرینوں میں ہوتا ہے تو وہاں اگر کوئی شخص وضو کرے یا آئینہ میں چہرہ دیکھے تو وہ صرف دل دل میں دعا پڑھ سکتا ہے، زبان سے نہیں، **مستفاد: ویدخل الخلاء..... والمراد بیت التغوط برجله الیسری .....، و.....یستعیذ .....باللہ من الشیطان الرجیم قبل**

دخوله وقبل كشف عورته (مراقی الفلاح مع حاشیۃ الطحطاوی ص ۵۱، مطبوعہ: دار الكتب العلمية بيروت)، قوله: "قبل دخوله": الأولى التفصيل، وهو إن كان المعد لذلك يقول قبل الدخول، وإن كان غير معد كالصحراء ففي أوان الشروع كتشمير الثياب مثلاً قبل كشف العورة، وإن نسي ذلك أتى به في نفسه لا بلسانه (حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی)، وفي مسألتنا المكان كله غير معد للخلاء بل المعد له هو البعض من ذلك وهو ممتاز عن الآخر، وقال فی الفتاوی الهندية: قال عين الأئمة الكرابيسي: لا تكره الصلاة في بيت فيه بالوعة كذا فی القنية (فتاوی عالمگیری قدیم ۵: ۳۱۵، مطبوعہ: مکتبہ زکریا دیوبند) فقط واللہ تعالیٰ أعلم.

محمد نعمان سیتاپوری غفرلہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمود حسن بلند شہری غفرلہ

مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۸/ فروری ۲۰۱۶ء یکشنبہ

❁ ❁ ❁

سوال: (۱) عرض یہ ہے کہ کیا ہر وقت ٹوپی پہننا ضروری ہے؟

(۲) اگر میں پینٹ شرٹ، جینس ٹی شرٹ پہنتا ہوں؛ حالانکہ میں کوئی غلط کام نہیں کرتا، نماز اور تلاوت کا پابند ہوں؛ لیکن میں چاہتا ہوں کہ لباس کے طور پر میں پینٹ شرٹ کوٹ، جینس اور ٹی شرٹ پہنوں تو اگر میں ایسا کرتا ہوں تو کیا میں گناہ گار ہوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامدًا مصليًا ومسلمًا: (۱) ہر وقت ٹوپی پہننا ضروری تو نہیں؛ البتہ کھلے سر پھرنے کی عادت ناپسندیدہ، خلافِ ادب اور فساق کا شعار ہے؛ اس لیے شرعاً مکروہ ہے، اس سے احتراز ضروری ہے، پیرانِ پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ويكره كشف الرأس بين الناس وما ليس بعورة مما جرت العادة بستره" یعنی اپنے سر کو اور بدن کے اس حصے کو جو ستر میں داخل نہیں ہے؛ مگر باشریعت باتہذیب نیک لوگوں کا طریقہ یا ان کی عادت یہی ہے کہ وہ اس کو چھپائے رکھتے ہیں تو سر کو یا بدن کے ایسے حصے کو لوگوں کے سامنے کھولنا مکروہ ہے۔ (غنیۃ الطالبین: ۱/۱۳) علامہ جوزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ولا يخفى على عاقل

أن كشف الرأس مستقبح وفيه إسقاط مروءة وترك أدب وإنما يقع في المناسك تعبداً لله یعنی عاقل شخص پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ لوگوں کے سامنے سر کھلا رکھنا مکروہ ہے، جس کو بری نظر سے دیکھا جاتا ہے، شرافت، مروت، ادب اور شریفانہ تہذیب کے خلاف ہے، شریعت میں صرف احرام حج میں سر کھلا رکھنے کا حکم ہے جس کا مقصود تعبد ہے۔

(۲) لباس میں اہلِ تقوی حضرات کے لباس کو اختیار کرنا چاہیے، اس کا اثر دیگر چیزوں پر پڑتا ہے، لباس سے فساق وفجار کی مشابہت مکروہ ہے، پینٹ شرٹ میں اگرچہ اب پہلے کی طرح تشبہ نہیں رہا؛ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ پینٹ شرٹ اب بھی صالحین کا لباس نہیں رہا؛ اس لیے پینٹ شرٹ کا پہننا ناپسندیدہ ہے، حتی الامکان اس سے احتراز کرنا چاہیے، یہ تفصیل اس صورت میں ہے؛ جب کہ اس سے واجب الستر اعضاء کی بناوٹ اور حجم نظر نہ آتا ہو ورنہ اگر اس سے واجب الستر اعضاء کی بناوٹ اور ساخت نظر آتی ہو، جیسا کہ جینس پینٹ میں ہوتا ہے تو اس کا پہننا ناجائز وحرام ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

فخر الاسلام عفی عنہ، نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی، وقار علی غفرلہ

مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

❁ ❁ ❁

احوال وکوائف دارالعلوم دیوبند

ادارہ

دارالعلوم دیوبند کو اللہ رب العزت نے جو مرجعیت ومحبوبیت عطاء فرمائی ہے، اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ دارالعلوم کے فضلاء وبہی خواہان اور ملتِ اسلامیہ کے تمام ہی طبقات، دارالعلوم کے تازہ حالات سے واقفیت کے خواہش مند رہتے ہیں؛ اسی لیے یہ چیز ماہ نامہ دارالعلوم کے مقاصد میں بھی شامل ہے؛ چنانچہ پہلے بھی حسبِ موقع حالات وواقعات کی اشاعت کا سلسلہ رہا ہے۔ اب امید ہے کہ آئندہ یہ عنوان رسالہ کا مستقل حصہ رہے گا، ان شاء اللہ۔

مجلسِ شوریٰ کا اجلاس

دارالعلوم دیوبند کے نظام میں مجلسِ شوریٰ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، تمام اہم معاملات میں فیصلے کا اختیار مجلسِ شوریٰ ہی کو ہوتا ہے۔ دارالعلوم کے تمام ذمہ داران اور ان کے واسطے سے تمام خدام وکارکنان، مجلسِ شوریٰ کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ شوریٰ کے سال میں دو اجلاس ہوتے ہیں ایک ہجری سال کے آغاز (محرم یا صفر) میں اور دوسرا تعلیمی سال کے اختتام پر ماہ شعبان میں۔ پہلے اجلاس کا مرکزی موضوع سالانہ بجٹ ہوتا ہے، دوسرے اجلاس کا اصل موضوع تعلیمی امور ہوتے ہیں۔ ان دونوں اجلاسوں میں حسبِ ضرورت دیگر موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔

اسی معمول کے مطابق ۱۲، ۱۳/صفر ۱۴۳۸ھ مطابق ۱۳، ۱۴/نومبر ۲۰۱۶ء اتوار پیر کو مجلس شوریٰ کا اجلاس مہمان خانہ دارالعلوم میں منعقد ہوا۔ جس میں سالِ رواں کے لیے انتیس کروڑ، انہتر لاکھ، پچانوے ہزار کا بجٹ منظور کیا گیا۔ مختلف شعبوں کی رپورٹیں پیش ہوئیں۔ حسبِ ضرورت متعدد انتظامی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ سابقہ مجلس کی کارروائی کی خواندگی وتوثیق بھی کی گئی۔

اس اجلاس میں شرکت فرمانے والے اراکین حسبِ ذیل ہیں:

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند)، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند)، حضرت مولانا غلام محمد وستانوی (اکل کوا)، حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی (لکھنؤ)، حضرت مولانا ملک محمد ابراہیم صاحب (میل وشارم)، حضرت مولانا مفتی محمد اسماعیل صاحب (مالیگاؤں)، حضرت مولانا مفتی احمد خان پوری (ڈابھیل)، حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب (علی گڈھ)، حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب (کشمیر)، حضرت مولانا انوارالرحمٰن صاحب (بجنور)، حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب (مظفرپور، موصوف نے اجلاس کی صدارت فرمائی)

ترکی مہمانوں کی آمد

۱۸؍صفر ۱۴۳۸ھ مطابق ۱۹؍نومبر ۲۰۱۶ء بروز ہفتہ ترکی سے دوموقر مہمان شیخ حمدی محمود ارسلان، استاذِ جامعۃ الفاتح استنبول (قسطنطنیہ) اورمحترم سردار پاشا ممثلِ جامعۃ الفاتح اسنبول تشریف لائے۔

مہمان خانہ میں حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم سے ان حضرات کی ملاقات ہوئی، استقبال کرنے والوں میں حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، جناب مولانا شوکت علی صاحب بستوی استاذِ تفسیر وادب وناظم عمومی رابطۂ مدارسِ اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند، جناب مولانا عارف جمیل صاحب استاذِ تفسیر وادب ومعاون مدیرمجلّہ الداعی اور مولانا محمد سلمان بجنوری استاذِ فقہ وادب ومدیر ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند شامل تھے۔

موقر مہمانوں نے ترکی کے ناکام انقلاب کے بعد وہاں کے حالات اورحکومتی اقدامات کی وضاحت کی، دارالعلوم دیوبند کی جانب سے جناب مولانا شوکت علی صاحب نے استقبالیہ کلمات کے ساتھ ترکی حکومت اور ترک قوم کے لیے نصرت وحمایت کے جذبات کا اظہار کیا، حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم نے نیک خواہشات پیش کیں۔ وفد نے دارالعلوم دیوبند کا شکریہ ادا کیا اور معائنہ رجسٹر میں اپنے گہرے قلبی تاثرات قلم بند کیے۔

❁ ❁ ❁

نئی کتابیں

نام کتاب : تیسیر الإنشاء (الجزء الأول)
مؤلف : جناب مولانا محمد ساجد قاسمی، استاذ دارالعلوم دیوبند
تعداد صفحات : ۱۶۴ قیمت: (درج نہیں)
ناشر : دارالمنار دیوبند
بہ قلم : مولانا اشتیاق احمد قاسمی، استاذ دارالعلوم دیوبند

==========

دین اسلام کے فروغ اور اس کی اشاعت کے لیے مدارسِ اسلامیہ قائم ہیں، ان میں دو قسم کے علوم پڑھائے جاتے ہیں: ''علوم عالیہ اور علوم آلیہ'' اوّل کا تعلق براہِ راست کیانِ اسلام کی حفاظت سے ہے؛ وہ قرآن وحدیث، فقہ اور ان تینوں کے اصول ہیں۔ دوسرے کی حیثیت معاون کی ہے، ان سے علومِ اسلامی کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے؛ مثلاً: منطق، فلسفہ، بلاغت، معانی، بیان، تاریخ، سیرت اور جغرافیہ وغیرہ۔ ان سے طالب علم فہم وتفہیمِ کتب وشریعت میں مدد لیتا ہے— اور یہ سب فنون چوں کہ عربی زبان میں ہیں؛ اس لیے ابتدائی جماعتوں میں نحو وصرف کے ساتھ عربی زبان کے ریڈرس پڑھائے جاتے ہیں، انھیں کے ضمن میں جملہ نگاری کرائی جاتی ہے، لکھنے اور بولنے کی مشق کرائی جاتی ہے، ''مفتاح العربیہ'' کے دو حصے انشار کی غرض سے ہی لکھے گئے ہیں، اس طرح طالب علم بہ تدریج مضمون نگاری تک پہنچتا ہے اور اُس میں کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوجاتی ہے، پھر قدیم نثر ونظم پڑھتے ہیں ان کے ذریعے اس کے پاس لغات کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوجاتا ہے۔ یہ طلبہ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کو اچھی طرح سمجھ کر امت کی رہنمائی کرتے ہیں، اس طرح مدارس کے قیام کا مقصد سامنے آتا ہے۔ زبان کو محض زبان اور ادب کی حیثیت سے پڑھانا، ان کے مقاصد واہداف میں داخل نہیں ہے، اس کے لیے دنیا بھر میں بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے ہیں؛ اس لیے قدیم فضلاء کی ایک

بڑی تعداد عظیم ترین استعداد کے باوجود خالص زندہ عربی زبان بولنے اور لکھنے پر قادر نہیں اور یہ کوئی عیب کی بات بھی نہیں— لیکن کیا عربی زبان کو زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھانا نہیں چاہیے؟ نہیں، ایسا نہیں! دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان کو زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھانے کی مہم حضرت اقدس مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ نے چلائی، وہ اور ان کے تلامذہ اس میں کامیاب ہوے، مولانا کیرانویؒ نے جس طرح ابتدائی ریڈرس لکھے، اسی طرح صفِ عربی، تکمیل ادب اور تخصص فی الادب کے ذریعے جدید نثر ونظم، اسالیبِ بیان اور تاریخِ ادب عربی جیسے مضامین کا اضافہ فرمایا، نئی جہت کی اس محنت سے اچھے اچھے قلم کار، انشاء پرداز اور قابلِ قدر زبان داں پیدا ہونے لگے اور مولانا کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا کہ آج اکثر فضلائے دیوبند عربی میں لکھنے اور بولنے پر قادر ہیں اور بہت سوں کی تقریر وتحریر زبان کی حدوں سے بلند ہوکر ''ادب'' کے بامِ عروج پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے؛ انھیں موفّق فضلائے دیوبند میں زیرتعارف کتاب کے مؤلف بھی ہیں، ان کی بہت سی نگارشات اہلِ علم سے دادِ تحسین حاصل کرچکی ہیں، ''القراءۃ العربیہ'' یونیورسٹیوں میں داخلِ نصاب ہے، ترجمہ نگاری کا بھی موصوف کو بہت اچھا ذوق ہے، متعدد کتابوں اور مقالات ومضامین کے ترجمے شائع ہوچکے ہیں، دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان وادب کے مقبول ومعروف استاذ ہیں، انھوں نے طلبہ مدارس کو بالکل ابتداء سے عربی زبان کو زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھانے کا تجربہ حاصل کیا ہے، ان کی خواہش ہے کہ نحوصرف کے قواعد وضوابط کو محض نظری نہ پڑھایا جائے؛ بلکہ ان کو تطبیقی اور تمرینی انداز میں اس طرح پڑھایا جائے کہ طالب علم ترجمہ نگاری اور انشاپردازی پر قادر ہوجائے، طلبہ کے پاس قدیم لغات کے ذخیرے کے ساتھ، جدید لغات کا بھی اتنا ذخیرہ ہو کہ وہ گردوپیش کے ماحول اور موجودہ زندگی کے نشیب وفراز کو تعبیر کرسکیں اور ترجمتین پر ان کو قدرت ہو۔ اس مہم کو تین مرحلوں میں سر کرنے جارہے ہیں، یہ پہلا مرحلہ ہے، اس میں چھتیس اسباق ہیں، تمرینات میں آیات، تاریخ اور روزمرہ کا اہتمام کیا گیا ہے اور بالکل اخیر میں فرہنگ بھی ہے؛ تاکہ مبتدی طلبہ بہ وقت ضرورت دیکھ سکیں۔

کتاب ماشاء اللہ بہت عمدہ ہے، طلبۂ مدارس کے لیے بڑی کارآمد بھی، امید ہے کہ مدارسِ اسلامیہ کے اساتذہ وذمہ داران کتاب کو بہ نظرِ استحسان دیکھیں گے اور اپنے نصاب کا جُز بنائیں گے، پہلا حصہ اپنی ظاہری ومعنوی خوبیوں سے مزین ہے، کاغذ، کتابت، طباعت اور ٹائٹیل دیدہ زیب ہیں، اللہ کرے یہ کتاب بھی مؤلف کی سابقہ تالیفات کی طرح قبولیت حاصل کرے! (آمین)